نقشِ ناتمام
(افسانوی مجموعہ)
ذکیہ مشہدی

نقشِ ناتمام

(افسانوی مجموعہ)

ذکیہ مشہدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

NAQSH-E-NATAMAM

(Short Stories)

by

Zakia Mashhadi

Year of Ist Edition 2008

ISBN 978-81-8223-457-4

Price Rs. 175/-

نام کتاب : نقشِ ناتمام (افسانوی مجموعہ)

مصنفہ : ذکیہ مشہدی

مصنفہ کا پتہ : F-1, Grand Pallavi Court, Judges Court Road, Patna-800004

سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۰۸ء

قیمت : ۱۷۵ روپے

مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

شفیع مشہدی کے نام

زندگی کی دھوپ میں جن کا وجود میرے لیے
ایک گھنا سایہ دار درخت ہے۔

فہرست

☆☆

کبھی نہ کبھی

تیئس سال قبل یعنی جولائی 1984ء میں میرا پہلا مجموعہ ''پرائے چہرے'' شائع ہوا تھا۔ جب سے اب تک اردو دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں جو یقیناً خوشگوار نہیں کہی جا سکتیں۔ کئی رسالے ایسے تھے جو خالص ادبی پرچے نہیں کہے جا سکتے تھے' اس کے باوجود خاصہ معیاری ادب پیش کر رہے تھے۔ ان کے لکھنے والوں میں نئے اور ایسے نام ہوتے تھے جن کا ادبی دنیا میں کوئی بڑا مقام نہیں تھا لیکن ان کے ساتھ ایسے معتبر لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن کا شمار ایوانِ اردو کے بلند و بالا ستونوں میں ہے' مثلاً راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، انتظار حسین وغیرہم ۔ یہ مقبول رسالے جنہوں نے عوام تک زبان کے ساتھ ادب پہونچانے کا کام انجام دیا، اب بند ہو چکے ہیں۔ معیاری ادبی رسالوں کی کون کہے۔ ''شب خون'' کا بند ہونا تو اردو ادب کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ لیکن جناب شمس الرحمن

فاروقی کی اپنی مجبوریاں تھیں۔

لوگوں میں بالعموم پڑھنے کی عادتیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔کمپیوٹراورٹی۔وی فرصت کے اوقات کا بڑا حصہ ہضم کر جاتے ہیں۔بچوں پر پڑھائی کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے اور بڑوں پر کام کا۔ملٹی نیشنل کمپنیوں اور دوسرے پرائیوٹ سکٹروں میں لوگ آج جس طرح کی ملازمتیں کررہے ہیں وہ انہیں دم لینے کی فرصت نہیں دیتیں۔یہ اور بات ہے کہ شوق ہوتو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وقت نکال کرلوگ شوق پورے کر لیتے ہیں۔

زندگی کی چھ دہائیاں مکمل کر چکی ہوں۔سن شعور سے اب تک جن تبدیلیوں کوذہن نشین کیا ہےان میں ایک واضح تبدیلی یہ ہے کہ جن گھروں میں اردورسالےنظر آتے تھے وہاں اب انگریزی (یا ہندی) رسالے رکھے دکھائی دیتے ہیں۔ہندی میں ادبی اورنیم ادبی پرچوں کے علاوہ بڑی تعداد میں خواتین کے رسالے شائع ہورہے ہیں۔ان کے سرورق نہایت دیدہ زیب،کاغذ عمدہ اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔اکثر و بیشتر ان میں لبھانے والے انعامات کی اسکیمیں بھی ہوتی ہیں۔اردوداں گھروں کی خواتین انہیں شوق سے خریدتی نظر آتی ہیں۔

میں پھر بھی مایوس نہیں ہوں۔

تئیس برسوں میں یہ چوتھا مجموعہ۔کوئی ایسا تیر تو نہیں مارالیکن نا مساعد حالات کے باجود لکھتی رہی ہوں،یہ تشفی بخش احساس مجھے ہے۔مجھے ہندی زبان پر دسترس ہے۔اگر ہندی میں لکھتی تو مجھے قارئین کی کہیں زیادہ بڑی تعداد ملتی اورشاید کچھ مالی منفعت بھی لیکن میں نے ان فواعد کوملحوظ خاطر نہیں رکھا۔اس میں کسی قسم کی عصبیت کا نہیں،اپنی زبان سے محبت کا دخل ہے۔ہندی میں میں نے ترجمے کئے ہیں اور تعلیم بالغاں کے سلسلے میں ہندی میں بہت کام کیا ہے لیکن افسانہ نگار میں اردو کی ہوں۔میرے زیور کے ڈبے میں زیور نہیں ہیں چند

خطوط ہیں اور میرے اپنے اندر پیدا ہونے والی مسرت اور سکون کی کیفیت جو کچھ لکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یہ میری افسانہ نگاری کا ماحصل ہیں۔

جب تک ذہن رسا ہے، لکھتی رہوں گی۔ قارئین ملیں گے، کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں۔ کچھ شکوک و شبہات ضرور سر ابھارتے ہیں۔ لیکن مایوس نہیں ہوں۔ اردو زندہ رہے گی اور اردو ادب بھی۔

ذکیہ مشہدی

☆☆

ہدّوُ کا ہاتھی

ہدّوُ نے پیپل کے پتوں کے بڑے بڑے جھنکاڑ رکشے سے اتارے، کثیف کرتے کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری برآمد کی، احتیاط سے گن کر رکشے والے کا کرایہ ادا کیا، بقیہ رقم واپس رکھی، پھر بڑی محنت سے موٹی موٹی ڈالیاں کھینچ کر انہیں احاطے کے اندر لائے۔

ہاتھی نے کسل مندی سے سونڈ دائیں بائیں جھلائی، پھر قدرے تکلف کے ساتھ بھاری بھرکم پاؤں آگے بڑھائے۔

"ارے بیٹا رک' اس سے قبل کہ لوگ تیرا حصہ کھا جائیں یہ لے لے۔" ہدّو نے بڑی محبت سے ہاتھی کو مخاطب کیا اور کندھے پر لٹکے انگوچھے کے سرے پر بندھی پوٹلی کھولی۔ پوٹلی میں چار عدد دوستی روٹیاں اور کوئی پانچ سات حلوے کی قتلیاں۔ ان میں صرف ایک چنے کی تھی اور باقی سوجی یا میدے کی۔

ہاتھی نے قریب آکر اپنا بھاڑ سا مونہہ کھول دیا۔ ہدو نے چاروں روٹیاں اور حلوہ، ایک ساتھ لپیٹ کر اس میں ڈالے تو اونٹ کے منہ میں زیرے والے محاورے

میں ذراسی ترمیم کردینے کو جی چاہا۔ ہاتھی نے پھر بھی تاڑ کے پتوں جیسے بڑے بڑے کان جھلے اور املی کے چیؤں جیسی ننھی ننھی آنکھوں سے بدّو کو انتہائی ممنونیت اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ بدّو نہال ہو اٹھے۔ ساتھ ہی ان کے دل میں ایک کچوٹ سی اٹھی۔ بے چارہ ہاتھی۔ استطاعت ہوتی تو کیا آج اسے وہ ٹوکرہ بھر کر حلوہ روٹی نہ کھلاتے؟ یا پھر میوے والا اروٹ اور گڑ کی بھیلیاں۔

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے بیوی چلاّئیں۔

''ارے اس کمبخت کو ڈھائی گھڑی کی آوے۔ بچے کھا لیتے حلوہ روٹی جو اس کے پیٹ میں ڈال دیا۔ اس کالے پہاڑ کا کوئی بھلا نہ ہو اور بچے محروم رہ جائیں۔''

''بچے ہیں کہ راون کی فوج! اپنا حصہ کھا چکے یہ ہمارا حصہ تھا ہم جسے چاہیں دیں۔'' بدّو گرجے۔

''ہم جسے چاہیں دیں۔'' بیوی نے مونہہ ٹیڑھا کر کے ان کی نقل کی۔ شاید انہیں کوئی معقول جواب نہیں سوجھا تھا۔ اس لئے مونہہ چڑانے پر ہی اکتفا کی۔

''نیک بخت، اوقات میں رہا کر، شوہر کا مونہہ چڑاتی ہے۔ جہنم میں جائے گی۔ صبح تین چار گھروں سے حصے آئے۔ سب تیرے یہ سپوت اڑا گئے۔ ہم نے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا۔ گئے تھے اسحٰق صاحب کے یہاں۔ ان کی اہلیہ، خدا انہیں جنت نصیب کرے، بولیں 'سید ہادی حسن، آئے ہو تو فاتحہ تمہیں پڑھ دو۔' ہم نے فاتحہ پڑھی تو اس کا حصہ انہوں نے الگ سے دیا۔''

''اوئی نوج مردوئے۔ اسحٰق میاں کی بیوی زندہ، جوان جہان۔ انہیں کہہ رہا ہے خدا جنت نصیب کرے۔'' بدّو کی بیوی ایسی دہشت زدہ ہوئیں کہ ذرا دیر کو تو ہاتھی کو حلوہ روٹی کھلا دئے جانے کا غصہ بھی بھول گئیں۔

بدّو نے شانِ بے نیازی سے ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اڑا رہے ہوں۔ ''ارے یہ تو دعا ہے جاہل عورت۔ زندگی میں ہی دے دینے میں کیا حرج ہے۔ آخر کبھی تو مریں گی اسحٰق میاں کی جورو۔ تم بھی ابھی سے ہمارے لئے دعا مانگا کرو کہ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑے گناہ سمیٹ رہے ہیں۔ اپنے غریب بے چارے ہاتو کو پیٹ

بھر کھانا بھی نہیں دے پاتے۔''

پھر وہی ہاتھی۔ بلکہ مارے محبت کے 'ہاتو' وہ بھی بے چارہ غریب۔ بیوی کی ایڑی میں لگی اور چوٹی میں بجھی۔ وہ چھنکیں۔

''بیوی بچوں کا پیٹ تو بھر لو پہلے۔ لٹکے رہتے ہو اس منحوس ہاتھی کی دُم میں۔ شب برات کے شب برات فاتحہ خوانی کے علاوہ بھی کچھ کرلیا کرو۔ اور فاتحہ خوانی بھی اب کہاں۔ جب سے تبلیغی جماعت والوں کا زور بڑھا ہے محلے میں فاتحہ کرانے والے گھر بھی بس دو چار ہی رہ گئے ہیں۔ نہ جلسے جلوس میں ہاتھی بلایا جائے نہ تم کچھ کر کے دو۔''

''کیوں کریں ہم کچھ اور۔ دادا پردادا کے وخت سے یہی فیلبانی کرتے آرہے ہیں۔ اور فاتحہ کیا ہم کسی لالچ میں کرتے ہیں؟ ارے لوگوں میں عزت ہے۔ سید ہیں ہم اور راجہ کے فیلبان ہیں۔ کبھی کبھار لوگ فاتحہ کے لئے کہہ دیتے ہیں۔'' بکتے جھکتے بدّو ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔

''تمہارے دادا پر دادا کو بھی کچھ اور نہیں ملا تھا کرنے کے لئے۔ بھلا بتاؤ سادات اور فیلبانی!'' بیوی نے پھر جل کر مونہہ مارا۔ ''خیر خود جو بھی کیا تمہیں کو کچھ اور ہنر سکھا جاتے۔ ہم تو کہیں اب بھی اس اللہ مارے بوڑھے بھوت کو وہیں پٹخ آؤ اس موئے راجہ کے......اور کوئی ایسا کام سنبھالو کہ گھر میں چار پیسے جڑیں۔''

ہاتھی کی شان میں کسی قسم کی گستاخی بدّو کو سخت ناپسند تھی۔ بلکہ تقریباً ناقابل برداشت۔ ہاتھی ان کے اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ تھے۔ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ سلطنت جون پور کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے۔ شاہی کے وقتوں میں یہ ایک بڑا معزز عہدہ تھا۔ بدّو کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے پھرتے تھے۔ وہ ان سب کو گومتی کے پانیوں میں نہلاتے، ان کے لئے میوہ اور گڑ بھرے روٹ تیار کراتے، گنّوں کی پھاندیاں اترواتے، اور پیار سے ان کے سوپ جیسے کانوں میں محبت بھرے نرم و شیریں الفاظ یوں اتارتے کہ اڑیل سے اڑیل ہاتھی

بھی پالتو کتے کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا۔

یہ ہاتھی کے اٹھ کھڑے ہونے کا بھی ایک الگ قصہ تھا۔

چودھویں صدی آخری سانسیں لے رہی تھی۔لوگ باگ دہلی کے تاج سے کرکٹ کھیل رہے تھے (اگر چہ کرکٹ اس وقت رائج نہیں تھا)۔ کمزور مرکز پا کر جو جہاں گورنر مقرر کیا گیا تھا، فرمانروا بن بیٹھا تھا یا کم ازکم بیٹھنے کے پھیر میں تھا۔ سلطنت جون پور بھی کئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی طرح معرضِ وجود میں آ گئی۔ بانی تھے سلطان الشرق ملک سرور خواجہ جہاں جو فیروز شاہ کے وقت میں ہی مشرقی علاقوں کے گورنر بنائے گئے تھے اور باوجود اس کے کہ خواجہ سرا تھے، نہایت لائق و فائق انسان تھے۔ صرف پانچ برس کے دورِ حکومت میں (کہ قضا و قدر نے اس سے زیادہ مہلت نہیں دی) جون پور کو دارالسرور بنا گئے۔ آگے چل کر شاہجہاں نے اسے شیرازِ ہند کے لقب سے نوازا۔

اس وقت قلعہ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ کوچ کا نقارہ بجنے پر فوجیں کوچ کیا کرتی تھیں دمادم، دمادم۔ شفاف سڑک پر صبح خاکروب جھاڑو لگاتے اور شام کو بھشتی مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے۔ سوندھی سوندھی خوشبو اڑتی تو عالموں کی ٹولیاں نکلتیں، خراماں خراماں۔ ڈھال گر ٹولہ میں لوہار ڈھالیں بنانے میں مصروف ہوتے اور درسگاہوں میں طالبعلم اپنے اپنے ذہن کو جلا بخشتے۔ درسگاہوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ایک صدی بعد شیر شاہ جیسا مدبر، ذہین اور رعایا پرور بادشاہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا (ڈھال گر ٹولے میں اب غریب مسلمان بیڑی بناتے ہیں اور ٹی بی میں مبتلا ہو کر قبل از وقت مر جایا کرتے ہیں۔ جون پور کے کسی مدرسے میں اب کوئی شیر شاہ پڑھنے نہیں آتا)۔

دہلی میں طوائف الملوکی کے اس دور میں جناب امیر تیمور صاحبقراں نے بھی اپنی ترچھی آنکھیں ہندستان کی طرف پھیریں۔ بڑے بڑے شہر بشمول دہلی اجاڑ ہوئے جیسے کوئی نہایت منحوس الو بول گیا ہو۔ صاحب علم واوصاف لوگ عزت اور جان و مال کی حفاظت کے لئے بھاگ بھاگ کر نسبتاً پر امن علاقوں میں اکٹھا ہوئے

جن میں جون پور بھی تھا جو دار السرور کے بعد دار الامان بھی قرار دیا گیا تھا۔ انہیں دنوں علی گڑھ سے ہجرت کر کے جو اس وقت کوئیل کے خوبصورت نام سے جانا جاتا تھا، ایک باریش بزرگ ایک مسیں بھیگتے نوجوان کے ساتھ، جوان کا پوتا تھا، ہاتھی پر سوار، جون پور سے تین میل دور موضع فیروز شاہ پور میں وارد ہوئے (جون پور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہ موضع ان کے کاغذات میں فروشی پور درج ہوا جسے بعد میں عوام نے پڑوسی پور بنا دیا) یہ بزرگ ان مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے بھٹیز کے قلعہ کے باہر ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر تیموری سپاہ سے جنگ کی تھی اور شکست یقینی جان کر زن و بچہ قتل کر کے 'جوہر' کی رسم ادا کی تھی۔ زندگی باقی تھی خود بھی بچ گئے اور یہ پوتا بھی جوان کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ میں شریک تھا۔

سید، عالم دین اور نہایت پاکباز ہونے کے سبب بزرگ جون پور میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اس وقت سلطنت کا فاؤنڈیشن اسٹون نصب کر کے خواجہ جہاں راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ مونہہ بولا بیٹا مبارک شاہ تخت پر تھا۔ بزرگ کو مبارک شاہ نے ایک قطعہ اراضی دی جس پر انہوں نے مدرسہ قائم کیا۔ کچھ عرصے بعد ان کا ہاتھی مر گیا تو سلطان نے ہاتھی بھی عنایت کیا۔ اطراف کا ایک بچ گوتی راج پوت بزرگ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسلام قبول کیا اور اپنی بیٹی ان کے پوتے کے نکاح میں دی۔ بزرگ ہاتھی والے سید صاحب مشہور ہو گئے اس لئے کہ فیروز شاہ پور سے جون پور آتے تو ہاتھی پر سوار ہو کر ہی آیا کرتے۔ جون پور اب شرقی سلطنت کا صدر مقام تھا۔

سید صاحب کا ہاتھی ایک دن جون پور میں اڑ گیا۔ اٹالہ چوک پر بیٹھا تو بس بیٹھے بیٹھے گھنٹوں کان جھلتا رہا۔ اٹھنے کا نام نہ لے۔ لاکھ مہاوت نے آنکس کے ٹہوکے دئے، پچکارا، سارا فن آزما لیا لیکن زمین جنبد، آسمان جنبد، نہ جنبد فیلِ سید۔ تب ان کے پوتے کے پانچ سالہ بیٹے نے، جس کی ماں نسلاً راجپوتنی اور مذہباً مسلمان تھی اور جو پردادا کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کرنے چلا آیا تھا ہاتھی کے گلے میں ننھے ننھے ہاتھ ڈال کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ہاتھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ قصہ کچھ ایسا زبان زد خاص و عام ہوا کہ لڑکا بڑا ہوا تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس کے پردادا کی

زمینوں میں اضافہ کر کے اسے فیل خانے کا مہتمم مقرر کیا۔ سید ہادی حسن عرف ہدو میاں کے کرم خوردہ شجرے میں فیل خانے کے مہتمم اور پڑوسی پور کے زمیندار سید سنجر حسین کا نام بالکل صاف لکھا نظر آتا ہے۔

ہاتھی کے پیٹ میں اتنا سارا حلوہ اور اصلی گھی لگی دوستی روٹیاں اپنی آنکھوں کے سامنے جاتے دیکھ کر ہدو کی اہلیہ کے کلیجے میں دھواں اٹھا تھا اور اب تک اٹھے جا رہا تھا۔ خالی برتن کھڑ کا کھڑ کا کر وہ مسلسل اپنے غصے کا ظہار کر رہی تھیں۔ ہدو پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر انہوں نے پیر پٹخے ''اب ہم خود جائیں گے پڑوسی پور اور اس کلموہے اللہ مارے ہاتھی کو چھوڑ آئیں گے وہاں۔ کوس کوس کے تھک گئے۔ مرا بھی نہیں۔ اب جائے وہاں سفیدے کے درخت روندے۔ اس موئے راجہ کے سفیدوں کو کیڑے لگیں، سوکھا مار جائے۔''

یہ سفیدے کے درختوں کا بھی ایک قصہ تھا:

ہدو کی بیوی کو سفیدے کے درختوں سے سخت چڑ تھی جس میں وہ حق بہ جانب تھیں۔ ان کی زندگی کے منظر نامے پر سفیدے کے درخت لکھے جانے سے پہلے زندگی اتنی بے ہنگم اور تاریک نہیں تھی۔ پڑوسی پور کے زمیندار بھیرو سنگھ کے یہاں ایک خستہ حویلی، کچھ زمینیں اور ایک عدد ہاتھی' خاتمہ زمینداری کے خاصے عرصے بعد تک برقرار تھے۔ راجہ صاحب کا لقب بھی برقرار تھا جو بے وقوف رعیت نے انگریزوں کے زمانے میں ان کے بزرگوں کے ہاتھ زمینداری آنے پر انہیں عنایت کیا تھا۔ اس وقت حویلی نہایت حسین اور بارونق ہوا کرتی تھی۔ ڈیوڑھی پر تین تین ہاتھی جھولتے تھے جن پر آٹھ ملازم مقرر تھے۔ ان کے خاص مہاوت کی سفارش پر ایک نواں ملازم مقرر کیا گیا۔ یہ ہدو کے پردادا کے والد تھے۔

سید سنجر حسین، مہتمم فیل خانہ شاہی اور محض تین ہاتھیوں پر مشتمل معمولی سے فیل خانے کے ایک معمولی ملازم کے درمیان گومتی میں بہت سارا پانی بہہ چکا تھا!

راجہ صاحب نے اپنے بچپن کے دوست گیا کے نواب احمد علی خاں سے خاصہ سبق سیکھا تھا۔ ان کے ہاں ہاتھی کے ساتھ رولس رائس بھی تھی۔ بچپن میں نواب

صاحب کے لئے انگریز گورنس ہوا کرتی تھی۔محل میں پچاس سے تین اوپر کمرے تھے لیکن وہ مرے تو ان کا گھر ایک کوٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ہاتھی اور رولس رائس محل سمیت نہ جانے کن لوگوں کی جیبوں میں سما گئے تھے۔انگریز گورنس کی جگہ ایک چندھی بڑی بی تھیں جو پرانے وقتوں کے احسانات نبھانے کے لئے دو وقت روٹی ڈال جایا کرتی تھیں۔سبزی بعض اوقات کافی نہیں ہوتی تھی۔نواب صاحب ایسے میں چائے سے روٹی کھالیا کرتے یا صرف اچار پر اکتفا کیا کرتے۔

راجہ صاحب نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔دو تو امریکہ میں جا بسے اور ایک باہر سے فلم سازی کی تربیت لے کر بمبئی میں مقیم ہوا۔اشتہاری فلمیں بنانے والا یہ نوجوان اپنے پیشے میں کافی کامیاب ہوا اور چند سال پہلے گاؤں آیا تو ضد کر کے باپ کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔شکستہ حویلی کی گرتی دیواریں پوری طرح گروا کر ملحق زمین سے اسے ملا دیا اور وہاں سفیدے کے درخت لگوا دئے کہ یہ نہایت منفعت بخش سودا ہے۔شاگرد پیشہ کی دو کوٹھریاں رہنے دیں ان میں اپنی پسند اور بھروسے کے مطابق دو جوان صحت مند کارندے مقرر کئے۔باقی لوگوں کو ہدو اور ہاتھی سمیت نکال باہر کیا۔راجہ صاحب کو ہاتھی سے بے حد لگاؤ تھا اور ہدو کو اس سے جو محبت تھی اس کے بھی معترف تھے۔اس لئے ہاتھی کو بیچنے کی تجویز پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ہاتھی ہدو کو سونپ کر جون پور میں ایک غیر مقیم ہندستانی دوست کے بنگلہ نما مکان کے احاطے میں اس کی رہائش کا انتظام کرایا اور ماہ بہ ماہ اتنی رقم بھیجنے کا وعدہ کیا جو ہاتھی اور ہدو کی کچھ حد تک کفالت ضرور کر سکے۔

اب تھا یہ کہ گاؤں میں حویلی کے شاگرد پیشے میں رہنے کے بہت فائدے تھے۔پھل پھلاری، سبزی ترکاری کی بہتات تھی جو چھوٹی رانی صاحبہ فراخ دلی سے ملازموں میں تقسیم کرتی رہتی تھیں۔ ہدو کے بچوں کے لئے عید بقرعید میں نئے کپڑے بن جاتے تھے۔ہدو فصل پر کٹائی اور دائیں میں مدد کر دیتے تو بہت سا غلہ مل جایا کرتا تھا۔نقدی زیادہ ہاتھ میں نہ آنے پر بھی فراغت کی زندگی تھی۔جو تین بچے اس دور میں پیدا ہوئے وہ نہایت صحت مند تھے۔جون پور آ کر پیدا ہونے

والے باقی تین نہایت مریل ۔اب تو تینوں بڑے بچوں کے گال بھی پچک گئے تھے۔ وہ اٹالہ مسجد کے پاس کے اقلیتی ادارے کی چھٹی کے اوقات میں چہار دیواری پھلانگ کر اندر گھس جاتے اور گولیاں اور تاش کھیلتے۔ گھر آتے تو ایسے بھوکے ہوتے کہ بس چلتا تو ہنڈیا برتن توڑ کے کھا جائیں ۔اس وقت ہدو کی بیوی کا جی چاہتا کہ وہ سفیدے کے درختوں میں آگ لگا آئیں یا ہاتھی کی تکا بوٹی کر ڈالیں جو بمبئی سے آنے والی قلیل سی رقم کا بیشتر حصہ کھا جاتا تھا۔

ایک آدھ مرتبہ بیوی نے تجویز رکھی ''ہم ڈھال گر ٹولہ جا کے دیکھ آتے ہیں۔ شاید کہیں بیڑی بنانے کا کام مل جائے۔'' ہدو بے حد ناراض ہوئے ''اب تم برقعہ اوڑھ کے گلی محلے کے لونڈوں کے بیچ سڑ پڑ کرتی گھوموگی۔ سیدانی ہو ذرا یہ تو سوچو۔''

ایک بار بیوی پھر ہتھے سے اکھڑ گئیں ''ہم تمہاری طرح کھرے سید نہیں ہیں۔ ہماری اماں پٹھانن تھیں اور پھر کام کرنے میں ذات کیسی۔'' انہوں نے اسی قدر چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا تھا۔

''سید کی بیٹی ہو نہ۔ اور سید کی بیوی بھی۔ بس بات ختم۔ اماں سے کیا ہوتا ہے۔ اماں سے نسل نہیں چلا کرتی۔''

اماں سے نسل چلتی ہوتی تو بیچ گوتیوں کی بیٹی نے کب کا سیدوں کو راجپوت بنا دیا ہوتا۔ اور آگے چل کر مغلوں کو بھی۔ بیوی نے حلوہ روٹی کے لئے زیادہ راڑ مچائی تو ہدو نے اس دریدہ دہن عورت سے کچھ دیر فرار حاصل کرنے میں ہی عافیت جانی اور گھر سے نکل لئے۔ جاتے جاتے ایک نظر ہاتھی پر ڈالی جو مزے سے گرو گرو کرکے پیپل کی ٹہنیاں چبا رہا تھا۔ حسب دستور پتے دیکھ کر محلے کی دو چار بکریاں بھی آ گئی تھیں اور پتوں پر مونہہ مار رہی تھیں۔ ہاتھی ان سے کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ شان بے نیازی سے یوں دیکھتا جیسے وہ راجہ ہو اور بکریاں اس کی غریب رعایا۔ ایک دوسرے کو سینگوں سے ٹھیلتی بکریوں میں سے دو ایک بکریاں ہاتھی کو دھکے بھی لگا دیتیں تب بھی وہ برافروختہ نہ ہوتا۔ اس کی اس فراخدلی کو دیکھ کر ہدو بھی کچھ نہ کہتے۔ اس وقت بھی ایک چھوٹی سی بکری اس کے موٹے موٹے ستون جیسے

پاؤں کے بیچ ہو کر سائبان تلے کھڑی جلدی جلدی پتوں پر موتہہ مار رہی تھی۔ ہدو کا جی بھر آیا۔

بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہدو اٹالہ چوک پر آ کے کھڑے ہو گئے۔ شاندار اٹالہ سر بلند کئے کھڑی تھی۔ سبک نہیں بلکہ مست ہاتھی کی طرح مہیب، بھاری، رعب دار، مسحور کن۔ ایسا لگتا تھا یہ مسجد ابھی چلنے لگے گی اور اس کے ساتھ چل پڑے گی کل کائنات۔ دمادم، دمادم۔ اور شاہی کا وقت پھر لوٹ آئے گا۔

بارونق اٹالہ چوک پر ایک رکشہ اکیلا کھڑا تھا۔ رکشے والا کہیں گیا ہوا تھا۔ شاید چائے پینے یا چائے پی کر پیشاب کرنے۔ یا صبح صبح اسٹیشن سے اچھی کمائی کر لایا تھا اور کہیں بیٹھ کر اسے اڑانے کے لئے پتے کھیل رہا تھا۔ ہدو وہیں کھڑے ہو گئے، کچھ بے دھیان سے۔ ایک برقعہ پوش عورت نزدیک آئی۔

''اے رکشے والے چلو گے، حمام دروازہ چلنا ہے۔'' اس نے ہدو کو مخاطب کیا۔

ہدو کو جیسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا۔

''ارے ہم تمہیں رکشے والے لگتے ہیں؟ ہم فیل بان ہیں فیل بان۔ وہ بھی ایسے ویسے نہیں راجہ کے فیل بان ہیں۔ جا کے دیکھ یاؤ پر لے محلے میں راجہ صاحب کے رشتے دار کی خالی زمین ہے۔ ہم اس پر رہتے ہیں۔ وہیں ہمارا ہاتھی کھڑا ہے۔ سب ہمیں جانتے ہیں اور ہمارے ہاتھی کو بھی۔ لگتا ہے تم یہاں نئی ہو۔ کسی گاؤں گراؤں سے آئی ہو شاید۔''

عورت اس مسلسل بوچھار سے گھبرا گئی۔ اسے یہ شخص کچھ سنکی معلوم ہوا۔ اس نے تیز تیز قدموں سے سٹک لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

ہدو بدبداتے ہوئے لوٹ آئے۔ عورتوں کے پیچھے لگنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ جب ان کا دل زیادہ دکھتا تو ہاتھی سے باتیں کر کے اسے ہلکا کر لیتے۔ اس وقت انہیں بڑا صدمہ پہنچا تھا، وہ ہاتھی پر چڑھ گئے اور گردن سہلا سہلا کے اس کے کان میں کہنے لگے ''سنا بیٹا، ایک پگلی سی عورت تھی، پاگل نہیں تو سنکی ضرور رہی ہو گی۔ ہمیں رکشے والا سمجھ رہی تھی۔ ارے ہمارے پاس رکشہ کھڑا تھا تو ہم رکشے والے ہو گئے؟ ارے

ہم فیلبان ہیں فیلبان۔''

ہاتھی نے بڑے بڑے کان جھل کر مکھیاں اڑائیں۔

''دیکھا ہمارا بیٹا کہہ رہا ہے اور نہیں تو کیا۔ سنکی نہیں پوری پاگل رہی ہوگی۔ چل بیٹا گومتی چل کے نہلا لائیں تجھے۔ گرمی بہت ہے۔'' بوڑھے ہاتھی نے السائی ہوئی آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں جیسے کہہ رہا ہو'' اب تمہارا جی چاہ رہا ہے تو لے چلو۔ چلتے ہیں۔''

تیکھے نقوش اور جلی جلی سی رنگت والے ہدو نے اٹالہ سے کچھ دور فیروز شاہی قلعہ کی چڑھائی پر ہانپتے کانپتے رکشہ آگے بڑھایا تو انہیں بے تحاشہ وہ عورت یاد آئی جس نے کچھ عرصہ پہلے انہیں رکشہ والا سمجھ کر حمام دروازہ چلنے کے لئے کہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی چھل پیری تھی یا اس کی زبان پر کالا دھبہ تھا۔ ویسے کالی زبان تو ہدو کی بیوی کی بھی رہی ہوگی جو ہاتھی یوں کھڑا کھڑا مر گیا تھا بے چارہ۔ لیکن موت کا ذائقہ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے، ہاتھی ہو یا چیونٹی اور مرنے کے لئے صرف ایک وجہ کافی ہے ... پیدا ہونا۔ اور موت اور پیدائش، ان دونوں کے علاوہ اس دنیا میں نہ کچھ حتمی ہے اور نہ قطعی۔ مزید یہ کہ ہاتھی جو خاصہ بوڑھا ہو چلا تھا آدھا پیٹ کھا کے زندہ رہنے والے انسانوں کی طرح زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن ہدو کی تسلی کے لئے ان میں سے کوئی حقیقت کافی نہیں تھی۔ وہ بلک بلک کے رویا کرتے تھے۔ ایک قلیل سی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ ہاتھی کے فراق میں۔ نہایت ایمانداری کے ساتھ انہوں نے راجہ صاحب کو ایک پوسٹ کارڈ لکھوا کے اس کی اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے ہدو کو کچھ یکمشت رقم بھیجی اور ایک جوڑ کپڑے۔ یہ ان کے لئے خلعت کا قائم مقام تھے اور ہاتھی کا آخری تحفہ۔

ساری رقم ختم ہوگئی تو ہدو حاجی رضا علی کے یہاں گئے۔ ان کے یہاں رکشے چلا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک کام چور، ٹی بی کے مریض رکشے والے کو انہوں نے حال ہی میں چھٹی دی تھی۔ اس کا رکشہ انہوں نے ہدو کو تھما دیا۔ شرمسار اور رنجیدہ ہدو

جب پہلے دن گردن جھکا کے اٹالہ کے رکشہ اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے تو ان کا دل بالکل اچاٹ تھا۔لیکن تب انہوں نے یاد کیا کہ ابھی کچھ دن پہلے ان کے پاس ہاتھی تھا۔ سچ مچ کا ہاتھی ۔اوران کے شجرے میں کہیں سید سنجر حسین تھے جو شاہی کے وقتوں میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے (اور ''شیراز ہند جون پور'' کے مصنف سید اقبال حسین کا کہنا تھا کہ اس وقت شاہی فیل خانے میں ہاتھیوں کی تعداد کم از کم چھ سو ضرور تھی)

ثبوت کے طور پر ہاتھی کے دانت کچی دیوار پر آویزاں تھے اور شجرہ بکس میں محفوظ تھا۔
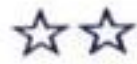
بوئے سلطانی

شیراز ہند جون پور کے شاہی قبرستان کی پشت سے لگی چلی گئی بستی کی ایک مکین صغریٰ نے ٹٹر ہٹایا اور گردن نیہوڑا کر مرغیوں پر نظر ڈالی۔ موٹی موٹی گول گول مرغیاں کٹ کٹ کرتی بڑی طمانیت سے گھورے پر غلاظت گھنگھول رہی تھیں۔ قبرستان کا پچھلا دروازہ حسب معمول چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ لوہے کا گرل پچھلے دنوں محلے کے لونڈے اکھاڑ لے گئے تھے۔ بیچ کر کھا گئے ہونگے یا جوئے میں ہار دیا ہوگا۔ لکڑی کا پھاٹک رہ گیا تھا۔ وہ بھی جلا کے ہاتھ تاپ لئے۔ تھوڑی بہت گھاس کے لالچ میں لوگ بکریوں کو اندر ہنکال دیتے تھے۔ موقعہ پا کر صغریٰ کی کچھ مرغیاں بھی گھس گئی تھیں اور شاہان وشاہزادگان اور امراء و وزرائے شرقیہ کی قبروں پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ (شاید اسی انجام کے لئے ان میں سے بیشتر حضرات اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں جدال وقتال میں مصروف رہے تھے۔)

"آ۔۔۔۔تی۔۔۔تی۔۔۔تی" صغریٰ نے انہیں پہلے باہر سے بلایا۔ اتنی شرافت سے پکارے جانے پر مرغیاں باہر نکلنے والی نہیں تھیں۔ اس لئے صغریٰ کو آگے بڑھ کر اندر جانا پڑا۔ مرغیوں کو سمیٹتے سمیٹتے اس نے ٹھوکر سے گدھے کی لید

کنارے کی اور زور سے بڑبڑائی ''حرامی کے پوت 'گدھا' بکری سب ہیئیں لے آ
لے آ کے چھوڑت جات ہیں۔''

مجاوروں کے خاندان سے صغریٰ کی بڑی یاد اللہ تھی۔ اب آ ہی گئی تھی تو سوچا
ان سے ملتی چلے۔ قبرستان پار کر کے وہ کھلی جگہ میں آ گئی۔ شاہی کے وقتوں میں
یہاں تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ شرقی سلطان بڑی دھوم کی عزاداری کرتے تھے۔ حسین شاہ
نے تو خود طبل ایجاد کیا تھا۔ ایسی گونجیلی آواز جیسے ان سلطانوں کی عظمت و سطوت،
چار دانگ عالم میں بجتے اس کے ڈنکے اور ان ڈنکوں کا ایک واحد طبل میں ارتکاز۔
اب وہاں بس ایک ذرا سی اونچی زمین ہے۔ چبوترہ بھی نہیں، بلکہ محض چبوترہ نما۔
کھردری کائی آلود دیواریں اور تھوڑی تھوڑی گھاس۔ دیواروں پہ اپلے چپکے ہوئے۔
جاڑوں کی پھیکی، کہر آلود دھوپ گوبر میں خمیر اٹھا رہی تھی۔ یخ ہوا چاروں طرف
سرسراتی پھر رہی تھی۔ امام چوک پار کرنے سے پہلے صغریٰ نے ایک نظر گرد و پیش پر
ڈالی۔ بدطینت لونڈے اس وقت آس پاس نہیں تھے۔ تھوڑی دیر گپ شپ کر لینے
میں کوئی حرج نہیں تھا۔

صغریٰ اس بار کچھ زیادہ چوکنی تھی۔ اس کی چیل جیسی نظروں کے باوجود پچھلے
دنوں کسی نے ایک مرغا غائب کر دیا تھا اور 'کسی' کون... وہی ہوگا برکت حرامی... جمنی
کا بیٹا۔ آتے جاتے صغریٰ کو دیکھ کر مسکراتا اور بڑی معصومیت سے پوچھتا 'مرغا ملا
چچی؟' چچی کی ایڑی میں لگتی اور چوٹی میں بجھتی۔ پچیس چوزے نکلے تھے۔ تیئس بیچ
دیئے تھے، ایک شب براءت کے دن ذبح کرایا تھا۔ سوجی کا حلوہ، گھی چپڑی روٹیاں
اور مرغا۔ صغریٰ کے شوہر نے خود ہی بدر بدر فاتحہ پڑھی۔ بھر پیٹ مرغا اڑایا اور رات کو
تاڑی چڑھا کے سو گیا۔ کیا پتہ جو نشے کی جھونک میں تاڑی پر بھی فاتحہ پڑھ ڈالی ہو۔
دوسرے دن صبح برکت نے ٹوکا ''ارے چچی، اکیلے مرغا اکیلے ہی کھا گئیں؟''
''آجا، آجا، سوجی کا حلوہ بچا رکھا ہے۔ کھا کے جائیو...'' صغریٰ نے خون کا
گھونٹ پی کر اس مسٹنڈے پڑوسی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اغل بغل ایسی
مخاصمانہ نیت والے ہوں تو عافیت اسی میں ہے کہ صلح کا ہاتھ بڑھا دیا جائے۔ پھر

اپنی نظروں میں عزت نفس بچائے رکھنے اور دل کو تسلی دینے کے لئے 'ان اللہ مع الصابرین' کا ورد بھی خاصہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

''سوجی کا حلوہ تمہیں کھاؤ چچی، بڑھاپا ہے۔ دانت کمزور ہو رہے ہونگے۔ چنے کی قتلی کھلاؤ تو معلوم ہو کہ شب براءت ہوئی۔ رہا مرغا تو وہ ہم کھا ہی لیں گے۔''

ساری مصلحتیں اور عزت بچانے والی آیات و مقولے ذہن سے غائب ہو گئے۔ زیادہ چھیڑا جائے تو کمزور وقتی طور پر اپنی کمزوری بھول کر آمادۂ پیکار ہو جایا کرتا ہے۔ اب بعد میں چاہے جو ہو۔ صغریٰ بدکلامی پر اتر آئی ''چور، مردار خور......'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''نہیں چچی، ہم تو ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ ڈر کے مارے ہندو ہوٹل میں نہیں کھاتے کہ کہیں جھٹکا نہ کھلا دے۔'' برکت ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ صغریٰ کی گالیوں کا اس نے برا نہیں مانا تھا۔ اس بے ضرر سی عورت کا برا کیا ماننا۔ برکت کی مہربانی تھی جو وہ چوزے بیچ لیا کرتی تھی ورنہ وہ چاہتا تو ہمیشہ ایک نہیں دو چار اٹھا لیجاتا۔ دو چار گالیوں کوسنوں سے زیادہ کی اوقات نہیں تھی اس کی۔ مرغی لاکھ پر پھلا پھلا کے دوڑے، چونچیں چلائے، آسمان سے جھپٹتی چیل سے نہیں لڑ سکتی۔ برکت نے جاتے جاتے بڑے مربیانہ انداز میں پلٹ کر صغریٰ کی طرف دیکھا تھا۔ ''ہمارے زیر سایہ آرام سے رہ لو۔ ہم نے تمہیں امان دی۔'' ازراہ مروت و مصلحت اکثر طاقتور کمزوروں پر اسی طرح کی نظر کرم رکھتے ہیں۔ اور طاقت کی بہت سے قسمیں ہیں جیسے دولت کی طاقت، علم و عقل کی طاقت، چالاکی و مکاری کی طاقت اور کچھ نہیں تو پھر تعداد کی طاقت جو ایک جماعت کو دوسری پر غلبہ عطا کرتی ہے۔

مڑ مڑ کے مرغیوں کو دیکھتی صغریٰ مجاوروں کے خاندان میں داخل ہوئی۔ یہ مفلوک الحال لوگ آنے جانے والے سیاحوں سے اپنا تعارف شاہان شرق کا رشتہ دار کہہ کر کرایا کرتے تھے۔ دراصل ان کا سلسلہ نسب خانقاہ نوحہ گراں میں بسنے والے ان مجاوروں سے ضرور ملتا تھا جو شاہوں پر نوحہ گر ہوا کرتے تھے۔ اب انہیں اپنی قوم کا مرثیہ پڑھنا چاہئے مگر یہ بے چارے فرائض نا آشنا، اپنی نئی ذمہ داریوں

سے آگاہ نہیں ہیں۔ بس اپنی مفروضہ وراثت پر فخر کرتے رہتے ہیں۔

گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا جس کے پیر پولیو نے مفلوج کر دیئے تھے بیٹھا گھر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ ویسے کتا بھگانے سے زیادہ کی اوقات نہیں تھی اس کی۔ خستہ حال مکان، خستہ حال مکیں۔

''بے فضول نکل پائے ہم۔'' بھناتی ہوئی صغریٰ بڑی مسجد کے صحن میں داخل ہوئی۔ ایک چھدرے سے پستہ قد درخت کے نیچے مولوی صاحب پندرہ بیس بچوں کو لئے بیٹھے تھے اور قمچی اٹھا کر کسی بچے کو دھمکا رہے تھے۔ ایک خوبرو، طرحدار، ہندستانی نوجوان لڑکا ایک فرنگن کو لئے صدر دروازے سے اندر آرہا تھا۔ مولوی صاحب نے ایک نگاہ غلط انداز دونوں پر ڈالی اور پھر بچے کو دھمکانے میں مصروف ہوگئے۔ ''انّ اللہ علیٰ کلِ شئی قدیر۔'' لڑکی نے ڈرڈر کے پڑھا۔

فرنگی کبھی کبھی ادھر آن نکلتے تھے۔ مونہہ کھول کھول کر سر اٹھا اٹھا کر جامع الشرق کی خوبصورتی دیکھتے اور مبہوت ہو کر اسے کیمروں میں قید کرتے۔ پھر وہ مسجد سے متصل قبرستان میں بھی جاتے۔

''کہا جاتا ہے کہ اس قبرستان کی قبروں کو کوئی کبھی گن نہیں سکا۔ گرچہ وہ کوئی بڑا اور گنجان قبرستان نہیں تھا اور بہت تھوڑی سی قبریں تھیں وہاں۔ ایک آدمی گنتا تو تعداد کچھ ہوتی، دوسرا گنتا تو دوسری۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ہی آدمی دوبارہ گنتا تو گنتی یکساں نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک دہریئے انگریز نے چاک سے قبروں پر نمبر ڈال کر گنتی کرنی چاہی۔ آخری قبر تک پہنچنے سے پہلے تیورا کر گرا۔ اٹھا تو زیادہ تر نمبر مٹ چکے تھے۔ قبرستان سے باہر لیکن بالکل متصل زمین پر کسی سلطان کے ہاتھی کی قبر بھی ہے۔'' لڑکا فرنگن کو بتاتا چلا آرہا تھا۔

صدر دروازے کے ایک کنارے پتھر کاٹنے والوں کی ٹھک ٹھک جاری تھی۔ ایک سیاہ فام نوجوان کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ اکیسویں صدی میں وہ جامع الشرق کے صدر دروازے میں بالکل ویسے ہی نقش و نگار ابھار رہا تھا جیسے اس کے اجداد نے صدیوں قبل بنائے گئے دروازے میں ابھارے تھے۔ عرف عام

میں بڑی مسجد کہلائی جانے والی اور دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں اسیر کرنے والی جامع الشرق کا صدر دروازہ سکندر لودی نے ڈھایا تھا۔ شرقی سلطنت کے آخری فرمانروا حسین شاہ شرقی سے سکندر کے باپ بہلول لودی کے وقت سے چلی آرہی لگاتار جنگ آخر میں حسین شاہ اور سلطنت جون پور کی تباہی کا سبب بنی۔ سکندر نے شرقیوں کے آثار تک اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر کے ساری حسین و پرشکوہ عمارتیں تہہ و بالا کر دیں۔ علماء و مشائخ نے کفر کا فتویٰ صادر کرنے کی دھمکی نہ دی ہوتی تو فنِ عمارت سازی کا یہ شاہکار بھی مٹ گیا ہوتا۔ اقتدار کی ہوس انسانوں سے لے کر پتھروں تک، ہر شئے کو تہہ و بالا کرتی چلی جاتی ہے۔ عبادت گاہیں شخصیتوں اور قوموں میں ضم ہو کر انا اور تشخص کا جز ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے اخلاقی ضابطوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے بعد کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔۔ سائنس نے ضرور آسمان میں تھگلیاں لگالیں۔ رشتہ دو افراد کے درمیان ہو یا دو ملکوں اور قوموں کے درمیان، یا کسی فردِ واحد کی بپھرتی، امنڈتی دوزخی انا ہو، دوسروں پر تسلط جمانے کی خواہش ویسی ہی ہے جیسی ہمیشہ تھی۔ بہار اور بنگال کے قحط کے دوران نہ جانے کتنی ماؤں نے اپنے بچے بیچے۔ اب روسی مائیں اپنے بچوں کو امریکہ لا کر بیچ رہی ہیں؛ گلی کوچوں میں اپنی عصمت کا سودا کر رہی ہیں۔ دنیا تو وہیں کی وہیں ہے۔ سیلولر فون اور سیٹلائیٹ چینل اور کمپیوٹر اور ہوائی جہاز اور نیوکلئیر و کیمیائی ہتھیار۔ اور صوفی اور مصلح اور بھجن اور قوالیاں گاتے (اخباروں میں مضامین لکھتے، ٹی وی پر مباحثے کراتے)، لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کرتے کچھ سر پھرے۔ جیسے نقار خانے میں طوطیاں۔ بہت شور مچایا تھا طوطیوں نے لیکن بامیان میں کھڑے، عدم تشدد کا سبق پڑھاتے مہاتما بودھ کو یار لوگوں نے اڑا دیا۔ اب طوطیاں شور مچا رہی ہیں کہ ہتھیاروں کے سب سے بڑے سوداگر امریکہ کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہتھیار رکھنے کے الزام میں عراق کو دوبارہ تہس نہس کر دے۔ ایں جناب آتے رہے اور آں جناب آتے رہے... یہ دو کوڑی کے عوام کیا چیز ہیں جو انسانی زنجیر بنا رہے ہیں۔ امنِ عالم کے لئے انسانی زنجیر بہ مقابلہ جناب بش... ہاہاہا۔

''پٹھالونڈیا زوردار لے کے آیا ہے۔'' پتھر کاٹتے کاٹتے فیروز نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا۔

لڑکا انگلی سے اشارہ کر کے لڑکی کو مسجد کی بلند و بالا، حسین و پر شکوہ عمارت دکھا رہا تھا۔

''عیش کرلو سالو۔ ہم دن بھر پتھر کاٹ کر جالیاں نکالیں اور تم سسرے آن آن کے انہیں دیکھو۔ ہماری طرح کے لوگوں نے برسوں اسی طرح پتھر کاٹے اور ڈھوئے ہونگے تب یہ مسجد کھڑی ہوئی ہوگی۔ ایک ایک نقش ابھارنے میں سارا سارا دن ٹھک ٹھک۔ ذرا کر کے تو دیکھو۔ پان سو برس بعد کوئی آ کے ہماری نقاشی کو بھی دیکھے گا، مگر ہمارا نام اس میں کہیں نہیں ہوگا۔ اور ابھی ہی ہمیں کیا مل رہا ہے۔'' ایک بھدی سی گالی مونہہ سے نکال کر فیروز پھر پتھر پر جھک گیا۔

ایسی باریک جالیاں... ایسی بلند و بالا محرابیں... ذرا سی دیر کو انسان بھول جائے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ پھر خود پر فخر کرنے لگے۔ یہ انسانی ہاتھوں کا کمال ہے یا جنوں اور بھوتوں کی کارستانی۔ وہ کون انسان تھے جنہوں نے یہ اور اس طرح کی محیر العقول فن کاری کے نمونے پیش کیے۔ لڑکی مبہوت کھڑی تھی۔

''حال ہی میں میں نے اڑیسہ میں کونارک کا سوریہ مندر دیکھا۔'' لڑکا لڑکی کو بتا رہا تھا۔ ''سورج دیوتا کے کپڑوں پر کی گئی کشیدہ کاری تک پتھر میں اتار دی گئی ہے۔ اور صبح، دوپہر و شام کے وقت چہرے کے مختلف تاثرات بھی۔ دوپہر کے سورج کے چہرے کی غضبناکی، رتھ کے پہیوں کی چھڑوں پر پڑتی دھوپ سے وقت کا بالکل صحیح اندازہ۔ اور وہ رتھ کو کھینچنے والے گھوڑے۔ وہاں میں بھی ایسے ہی ٹھگا کھڑا رہ گیا تھا۔ بارہ سو مزدوروں، سنگ تراشوں، اور معماروں نے بارہ برس کام کیا تھا تب وہ مندر بن کر تیار ہوا تھا۔''

''میرے اڑیہ گائیڈ نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں کہا (وہ سخت سردی میں بھی صرف ایک دھوتی پہنے اوپر کے جسم سے ننگا تھا اور اس کا چہرہ موسموں کی مار کھا کھا کر سخت اور بے رونق ہو چکا تھا۔ وہ زبردستی میرے پیچھے پڑ کر میرا گائیڈ بن گیا

تھا۔ پچاس روپے سے شروع ہو کر اس کی خدمات دس روپے تک اتر آئی تھیں۔ میرے یہ کہنے پر کہ مجھے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے اس نے انتہائی مسکینی سے کہا تھا کہ دس روپے اس کے لئے اہم ہیں جبکہ میں روزانہ اس سے زیادہ رقم سگریٹ میں اڑا دیتا ہونگا۔ نوجوان کے ذہن میں اس کی شبیہ در آئی۔ وہ کچھ کچھ ویسا ہی تھا جیسا مندر کے صدر دروازے کے پاس پتھر پر چھینی چلاتا یہ کالا کلوٹا مسکین صورت انسان)''

''...تو میرے اس اڑیہ گائیڈ نے مجھ سے کہا کہ مندر کی سیر ہو چکی اب ذرا سوریہ دیوتا کی پتنی چھایا کے مندر میں چل کر انہیں بھی پرنام کر لیجئے تو میں نے جواب دیا کہ میں ان بارہ سو سنگتراشوں، مزدوروں اور معماروں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے یہ مندر بنایا۔ چھایا دیوی کو پرنام کر کے کیا کرونگا۔''

لڑکی جواب تک خاموشی سے لڑکے کا لکچر سن رہی تھی بولی''...تم...تم تو مسلمان ہو۔''

''تو؟''لڑکے کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

''مندر کے معماروں کو سیلوٹ کیوں کر رہے تھے؟''

''محنت کش فنکار جہاں کہیں دکھائی دیں میں انہیں سلام کرتا ہوں۔ بائی دی وے، تمہارے باپ کا کیا جاتا ہے۔''جملے کا آخری ٹکڑا لڑکے نے اردو میں ادا کیا تھا۔ باقی وقت وہ شستہ اور رواں انگریزی میں گفتگو کرتا رہا تھا جو اسے ان اعلیٰ درجے کی انگریزی درسگاہوں سے حاصل ہوئی تھی جہاں اس کے طبقے کے بیشتر افراد پڑھنے جاتے تھے۔

''کیا؟''لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس چپ ہی رہو۔ زمانہ پہلے تم، ہم ہندستانیوں کو ہندو اور مسلمان ہونے کا خاصہ احساس کرا چکے ہو۔ اور وہ تمہاری چڑیل مسز بیور تج...''اب کی اس نے انگریزی میں چڑیل پر ودی تھی۔

''چڑیل کیا؟''

''یار انگریزی میں گالی دو تو لگتا ہے سانپ کے زہریلے دانت توڑ دیئے گئے

ہیں۔اور ہماری ہندستانی گالیاں۔یہاں تم لوگ مات کھا گئے۔تمہاری گالیوں میں دھار قطعی نہیں ہے۔''

''اور بھی بہت سی چیزوں میں ہم تم سے کم ہیں۔گالیوں کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں۔مگر ہاں جیسے دوسروں پر الزام تراشی ...... پچاس برس سے زیادہ ہوئے کہ ہم نے تمہیں...''لڑکی نے شرارت سے 'ہم' پر زور دیا تھا۔''ہم نے تمہیں آزاد کر دیا تھا کہ تم اپنے فیصلے خود کرو، اپنی حکومت خود چلاؤ تمہارے بچے ادھیڑ ہو گئے، تمہارے جوان بوڑھے پھوس ہوئے اور بوڑھے پھوس چل بسے لیکن تم آج بھی اپنی ساری بنیادی ذہنی اور جذباتی خباثتوں کے لئے ہمیں ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہو۔''

لڑکے نے کچھ کہنے کے لئے مونہہ کھولا ہی تھا کہ لگا اچانک ازمنۂ وسطیٰ کی کسی توپ کا دہانہ کھل گیا ہو۔

''ارے تم کا ہیجہ دھرے، گولی لگے ہیجہ گڑ وَ۔اب کے ادھر نجر آئے کے دیکھو تو۔ٹانگ توڑ کے ہاتھ پہ نہ دھر دیں تو کہیو۔'' وہ عورت انتہائی فراٹے سے کسی کو کوس رہی تھی۔وہ عورت صغریٰ تھی۔

لڑکا پیٹ پکڑ کے ہنسنے لگا۔لڑکی ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہی پھر چڑ کر بولی''کیا میرے دانت اور سینگ اگ آئے ہیں؟''

''نہیں محترمہ۔میں تو اس خوبصورت اتفاق پر ہنس رہا ہوں۔کیا بلیغ کوسنے ہیں۔واللہ روح تر ہو گئی۔یہ عورت کسی کو کوس رہی ہے کہ وہ ہیضے میں مبتلا ہو کے مر جائے اور زمین میں گاڑ دیا جائے۔یا اسے کسی کی گولی لگ جائے۔''

''اس میں اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہے؟''لڑکی چیں بہ جبیں تھی۔

''رہو گی احمق کی احمق فرنگی بندریا۔ارے بے وقوف ترجمے سے سارا زہر نکل گیا۔گالیوں اور کوسنوں کا بھی کسی نے کامیاب ترجمہ کیا ہے؟ راج کے زمانے میں لکھنو کے نوابوں کے مصاحب (اور عوام بھی) کسی فرنگی کو جاتا دیکھتے تو اس کے پیچھے لُو لُو لگاتے۔لُو لُو ہے بے لُو لُو ہے...اس بے بس نفرت کا ترجمہ کوئی اور زبان کبھی نہ

کر سکے گی۔ لولو کیا ہے یہ ہم کیا کوئی ماہر لسانیات بھی نہیں بتا سکتا۔''

لڑکے کے بے ساختہ ہنسنے سے صغریٰ بھی کچھ کھسیانی سی ہو گئی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ہنسی کا موضوع اس کے کوسنے ہی تھے۔ اس لئے صفائی پیش کرنے کو وہ ذرا قریب آ گئی۔

''ہنسنے کی بات ناہیں ہے بھیا۔ دیکھو نا ڈبل دروجہ رہا۔ پھر لوہے کا گریل اور لکڑی کا بڑا پھاٹک۔ ڈیڑھ دو کلو کی تو کنڈی رہی۔ کونو کھول کے لے گوا۔ پھر دو چار دن پہلے لکڑی کا پھاٹک توڑ کے ہاتھ تاپ گئے حرامی کے پوت......''

محترمہ اب کچھ وضاحت فرمائیں گی کہ یہ حرامی کے پوت کون ہیں جنہیں آپ نواز رہی ہیں'' لڑکا عوت سے مخاطب ہوا۔

عورت کا مونہہ پہلے کھلا پھر بند ہوا'' کا کہیو بھیا؟''

''ہمارے اور آپ کے درمیان زبردست کمیونی کیشن گیپ ہے۔ اس لئے جانے دیجئے۔ پھر کبھی'' لڑکا اسے مزید کھسیانا چھوڑ کر آگے بڑھ چلا۔ لڑکی نے نوٹ بک کھولی۔

''ہمارے بادشاہوں کے بارے میں لوگ آج بھی باتیں کرتے ہیں۔ ان پر کتابیں لکھتے ہیں'' ایک بار مدرسے کے مولوی صاحب نے ہل ہل کر سیپارہ پڑھتے ہوئے بچوں کو بڑے فخر سے بتایا تھا۔

بادشاہ جیسی کسی شے کا تصور بچوں کے ذہن میں بہت واضح نہیں تھا۔ بڑی مسجد، اس کے صحن میں بنا حوض، تختی، غیر دلچسپ کتابیں، مولوی صاحب اور ان کی قمچی، چڑچڑے ابا، دبلی پتلی منحنی سی، چولہا پھونکتی اماں... یہ سب الفاظ ان کے ذہن میں اپنا تصور بیدار کرتے تھے اور معنی رکھتے تھے۔ لیکن بادشاہ؟ (ویسے پتلی دال، روٹی اور کبھی کبھار چالیسویں کے پلاؤ پر بسر کرنے والے مولوی صاحب کے اپنے ذہن میں بھی بادشاہوں کا کوئی ایسا خاص واضح تصور موجود نہیں تھا۔)

''ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔'' پہلے زمانے کی نانی، دادیوں کی کہانیاں یونہی شروع ہوا کرتی تھیں۔ لڑکے کی پر دادی نے کہانی آگے بڑھائی تھی

''بادشاہ کا نام تھا دل آرام۔ایک دن شکار کھیلتے وقت اس کی ملاقات ایک لکڑ ہارے سے ہوئی جو ایک خشک پیڑ پر دنا دن کلہاڑی چلاتا پسینے سے شرابور روزی روٹی کے انتظام میں مصروف تھا۔مصاحب نے للکارا''...ابے کون ہے بے تو؟ نام کیا ہے تیرا ؟اتر نیچے۔''وہ کود کر نیچے اترا۔زمین بوس ہو کر آداب بجالایا پھر گویا ہوا''دل آرام''

''بادشاہ ہنسا۔کہنے لگا' کیا عجب ہے کہ میرا نام بھی دل آرام ہے اور میں بادشاہ ہوں۔' لکڑ ہارے نے جواب دیا' کچھ عجب نہیں جہاں پناہ۔کاتب تقدیر نے میری قسمت میں لکھا لکڑیاں کاٹنا اور آپ کی قسمت میں لکھا حکومت کرنا۔نام میں کیا رکھا ہے عالم پناہ سار کھیل تو تقدیر کا ہی ہے۔''

''شاہی کے وقتوں میں وہ سب لوگ بھی ہوا کرتے تھے جو لکڑی اور پتھر کاٹتے تھے تاکہ شاہوں کے نام زندہ رہ سکیں۔یہ لوگ بہت زیادہ تھے اور شاہی کرنے والے کم پھر بھی تاریخ ان کے بارے میں چپ ہے۔''

لڑکے نے کہا

لڑکی نے مینگنیاں ہٹائیں اور دو قبروں کے درمیان اطمنان سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔''تم ایک بہت دلچسپ ،سات سو برس پرانی قبر سے نکلی روح ہو۔داستان جاری رکھو۔''اس نے نوٹ بک کھولی اور بالوں کے جوڑے میں اڑسا ہوا قلم سنبھالا۔

''جون پور فیروز شاہ تغلق نے بسایا تھا۔بعد میں شرقی سلطانوں کے قبضے میں آکر ان کا دارالسلطنت بنا۔فیروز کی ماں ابوہر کی راج پوت شہزادی تھی۔مسلمان ہو کر بی بی نائلہ کہلائی۔''

''نام نہاد غیر ملکی حملہ آوروں کے خون میں ہندستانی خون کی آمیزش اتنا زمانہ ہوا کہ شروع ہو چکی تھی۔''

لڑکی مسکرائی

''نام نہاد غیر ملکیوں کے خون میں نام نہاد ہندستانی خون۔''لڑکے نے بات آگے بڑھائی''راج پوت تو ان شک ،ہون اور کشان حملہ آوروں کی اولادوں میں

تھے جو مسلمانوں سے پہلے 'باہر' سے وارد ہوئے تھے اور مسلمانوں کی آمد سے پہلے خاصے پرانے ہو کر ہندستانی بن چکے تھے۔ ہم ہندستانیوں کے گھر میں جب کوئی بہو بیاہ کر آتی ہے تو عرصے تک وہ باہر والی سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے کی بیٹی۔ گھر کے بہت سے اسرار و رموز بھی اس سے چھپائے جاتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد وہ گھر میں رچ بس جاتی ہے۔ کچھ بچے پیدا کر کے ماں اور گھر والی کا درجہ پاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنا بیٹا بیاہ کر بہو کو 'پرائی بیٹی' کا خطاب دینے کا اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن ہم مسلمان ایک ہزار سال یہاں گزار لینے کے بعد بھی ''گھر والوں'' کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکے۔ تاریخ چلتی رہتی ہے۔ خود کو دہراتی جاتی ہے۔ لیکن تاریخ سے سبق کوئی نہیں حاصل کرتا۔ کوئی کسی چیز سے سبق حاصل نہیں کرتا۔ ہیرو شیما اور ناگا ساکی کے بعد اس سے بھی زیادہ تباہی لانے والے بم بن کر تیار ہیں۔''

اچانک اس کے چہرے سے کھلنڈرے پن کا نقاب سرک کر ایک ٹھنڈی سنجیدگی نکل آئی تھی۔ اس کی آنکھیں راکھ جیسی لگنے لگی تھیں۔ شائد ان عراقی بچوں کی طرح جو دواؤں کے فقدان کی وجہ سے مر رہے تھے۔

''بکواس بہت کرتے ہو۔ کلی پھندنے کم ٹانکو۔'' لڑکی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہندستانی خون کی آمیزش۔ زیادہ آسان تو یہ کہنا ہے کہ مسلمان خون میں ہندو خون۔''

''لیکن اس راجپوت کنکشن کے باوجود یہ حضرت کچھ زیادہ مسلمان نکلے۔ سنا بہت مندر توڑے، ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا۔'' لڑکی نے لقمہ دیا

وہ میڈیویل پیریڈ تھا۔ ایسا کچھ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن یہ سارے کلی پھندنے آپکے مورخوں نے زیادہ ٹانکے۔ مسلمان حکمرانوں نے مندر بنوائے بھی اور پہلے کے بنے مندروں کو جاگیریں بھی عطا کیں۔ لیکن ان کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ ان واقعات کا صحیح تناظر میں تجزیہ بھی نہیں کیا جاتا۔ مذہب سے زیادہ ان میں سیاست کا دخل تھا (یہ دیکھنے ماننے کو کوئی تیار نہیں۔ اور اب... اب تو تاریخ دوبارہ لکھی جا رہی

ہے۔ویسی جیسی کہ حکمراں طبقہ چاہے۔)بعد میں آنے والے ظہیر الدین محمد بابر نے زندگی اور حکمرانی کی ابتدا چچا اور ماموں کے ساتھ جنگ کر کے کی۔نہ دادیہال کو بخشا نہ نانیہال کو۔لیکن جب ہندستان آئے تو سپاہیوں کو جہاد کا نعرہ دیا۔روز حشر اگر ملاقات ہوئی تو ان کا ایک انٹرویو ضرور کرونگا۔نہایت نبض شناس اور مدبر سیاست داں تھے مگر ہاں بابری مسجد سے بے چارے کا دور دور واسطہ نہ تھا۔یہاں یار لوگوں نے پرچے چھپوا چھپوا کے بانٹ دئے کہ دو لاکھ ہندو رام مندر کی حفاظت کرتے ہوئے کٹ گئے۔کسی نے دو لاکھ سے بھی زیادہ تعداد گڑھی۔''

''ارے یہ بابر نامہ کیوں شروع کر دیا۔میرے نوٹس؟''لڑکی جھنجھلائی۔

''آپ جس شرقی سلطنت پر نوٹس تیار کر رہی ہیں اس کے لئے دیوار پر شیرہ لگایا تھا امیر تیمور صاحبقراں نے جنہیں آپ حضرات ٹیمر لین کے نام سے بھی جانتے ہیں۔وہ انتہائی درجے کے سیکولر انسان تھے۔ان کی تلوار جب شپاشپ چلتی تھی تو یہ نہیں دیکھتی تھی کہ اس کے تلے آنے والی گردن جس کی ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ تلمند کے شہریوں کو امان دینے کے بعد بھی لوٹا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یاد رہے تلمند میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔عاجز آکر ہندو مسلمان دونوں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کیا اور شانہ بہ شانہ مقابلے پر نکلے۔ساتھ جی رہے تھے ساتھ مرے اور مر کر یوں خلط ملط ہوئے کہ یم راج اور حضرت عزرائیل دونوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔''

قلم کا ڈھکن دانتوں تلے دبا کر لڑکی پھر مسکرائی''خاصے بیہودہ ہو۔''

وہ ایک خوبصورت فرنگن تھی۔گالی کھا کے لڑکا قطعی بے مزہ نہ ہوا۔اس نے داستان جاری رکھی۔''لاکھوں لوگوں کے قتل کے بعد صاحبقراں نے نہایت آرام سے جمنا پار کی، جہاں نما کی عمارتوں کی سیر کی، شاہان تغلق کی بنائی ہوئی مسجدوں کو پسند فرمایا، کاریگروں کے ہاتھ پیر باندھ کر ساتھ لے جانے کا منصوبہ بنایا۔لوٹ کی دولت اور بے بس کاریگر۔وسط ایشیا کی مسجدوں کی تعمیر کے لئے نہایت موزوں خام مال۔''وہ ایک افسردہ ہنسی ہنسا۔

''واہ کیا اعصاب رہے ہونگے! اتنا وسیع قتل عام اور ایسا پر سکون ذہن'' لڑکی نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر داد دی۔

''محترمہ حکمراں ہر دور میں ایک ہی سے رہے ہیں ۔نریندر مودی کے اعصاب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ پچھلی جنگ کے بعد عراق میں لاکھوں بچے طبی سہولت نہ ملنے سے مر گئے ۔افغانستان میں لاکھوں بے گناہ شہری مارے گئے ۔گجرات میں لوگوں نے گوروِ یاترا نکالی۔ ویسے ہی جیسے کبھی تیمور اور چنگیز نے بغلیں بجائی تھیں ۔مگر ہاں......'' وہ ذرا کی ذرا رکا'' ان حضرات کے دور میں بم ایجاد نہیں ہوئے تھے۔اور ہلاکو بغداد کو تاراج کرنے کے بعد وہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھا نہیں تھا جیسے تمہارے یہ بش خاں۔''

لڑکی نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔''بش میرے ملک آئے تھے تو میرے ہم وطنوں نے انہیں کالے جھنڈے دکھائے تھے۔''

لڑکے نے آنکھیں سکوڑیں۔اس کی آنکھوں میں گہرا تمسخر تھا اور کہیں بڑی گہرائی میں نفرت سلگ رہی تھی۔''لاکھوں جانیں تلف کرنے کی سزا......کالے جھنڈے۔'' وہ ہنسا ایک پھیکی تلخ ہنسی۔

سرد ہوا کا ایک جھونکا ٹھنڈے خطے سے آنے والی اس لڑکی کے جسم میں پھریریاں پیدا کرتا گذر گیا۔اس نے سوئیٹر کے بٹن بند کئے اور بیگ سے اسکارف نکال کر سر پر باندھا۔ مسجد کے صحن میں جو بچے پڑھ رہے تھے اور مولوی صاحب جو ان کو پڑھا رہے تھے،ان میں سے کسی کے جسم پر وافر کپڑے نہیں تھے۔بچوں میں کئی ننگے پیر بھی تھے اور ننگے پیر وہ بھی تھا... فیروز شاہ کا ہم نام۔ جامع اشرق کے صدر دروازے پر بیٹھا پتھر تراش رہا تھا۔اور یہ سب دہشت گرد قرار دئے جاتے تھے اور غریب مولوی دہشت گردوں کا استاد۔

لڑکا اب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک قبر کی پائنتی لگی مرمر کی پٹی پڑھنے لگا۔ پھر وہ یوں گویا ہوا:

''حضرت ٹیمر لین نے دلی کی نیم جاں سلطنت کو بالکل ہی تہس نہس کر دیا اور

کئی گورنروں کی طرح مشرقی خطے کے گورنر خواجہ جہاں ملک سرور کو بھی موقع عنایت فرمایا کہ وہ خود مختار حکومت کا اعلان کر دے۔ خواجہ جہاں نے جون پور کو پایہ تخت بنایا جس کی اسٹیج پر شروع میں تیزی سے کئی کردار تبدیل ہوئے۔ پھر یہ آئے ... یہ جو یہاں آرام فرما ہیں۔ (ویسے ایک خیال یہ بھی ہے کہ قبروں کے پائنتی ناموں کی یہ پٹیاں مصدقہ نہیں ہیں لیکن بہر حال انگریز بہادر کچھ تحقیق کروا کے لگوا گیا ہے۔) ...ابراہیم شاہ شرقی۔ چالیس برس راج کیا۔ بہت سی جنگیں لڑیں۔ ترہت کے ایک باجگذار راجہ کیرت سنگھ نے مدد مانگی تو اس کی حمایت میں اس کے عدو ارسلان خاں پر چڑھ دوڑے۔ دینی بھائی ارسلان خاں کا سر کاٹ کے کیرت سنگھ کے حوالے کیا ۔ کیرت سنگھ کی جشن تاجپوشی میں شرکت کی۔ میتھلی کے عظیم شاعر ودیا پتی نے اپنے قصیدے کیرتی لتا میں اس تقریب کا ذکر کیا اور ابراہیم شاہ کے بارے میں لکھا 'یہ بادشاہ سب سے اوپر تھا... اس کے اوپر صرف خدا تھا۔'

امید ہے جہاد اور تلواریں چمکا کر ہندوؤں کو تہہ تیغ کر کے اسلام پھیلانے کے بارے میں تمہارے سنہرے بالوں سے ڈھکے اس خرافاتی سر کے اندر کچھ گھسا ہوگا۔ جدال و قتال اس دور کی خاصیت تھی۔ مگر کیا آج نہیں ہے؟ طرز ہی تو بدلا ہے۔ تلواریں چلا کر بازو دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہیروشیما کے وقت تم نہیں تھیں ہوتیں بھی تو کیا تھا۔ جاپانی تو نہ ہوتیں۔ اپنے محفوظ خطے کے محفوظ گھر میں...''

''تم تھے کیا؟''

''ہاں میں تھا۔ میں ایک ہزار سال پرانی روح ہوں۔ تم نے تو صرف سات سو برس کہا تھا۔''

''اور شاید سنٹرل ایشیا یا عرب سے آئے رہے ہوگے؟'' لڑکی کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''محترمہ دنیا میں جتنے آئے سب کہیں نہ کہیں سے آئے ہونگے۔ انسان اگا کہاں یہ وثوق سے کس نے بتایا؟ ہاں کہیں اگا ضرور اور وہاں سے جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پھیلا۔ وقت اس کے بیج اڑاتا، اڑا کے بوتا چلا گیا۔''

اس نے قبر پر (شاید) محبت کے ساتھ ہاتھ پھیرا۔

''یہ بڑا ہی منکسر المزاج اور علماء اور صوفیوں کی قدر کرنے والا بادشاہ تھا۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ جامع الشرق کو ہی دیکھ لو جہاں تم بیٹھی ہو۔ سکندر لودی کے حملے میں اس کا بھی ایک حصہ زد میں آیا تھا۔ آج جون پور کے عوام دوبارہ بنوار ہے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ پرانے دروازے کی ہو بہو نقل اتار لی جائے۔ ہم آرہے تھے تو وہ کاریگر پتھر پر جھکا چھینی چلا رہا تھا۔''

''کس کو گلیا رہی تھیں صغریٰ خالہ؟'' فیروز نے چھینی الگ رکھ کے ہاتھ سیدھے کئے اور انگلیاں چٹخائیں۔

''ارے اور کسے؟ وہی تھے دو چار لونڈے۔ تاش کے پتے پھینٹتے۔ آرہے تھے قبرستان میں بیٹھ کے جوا کھیلنے۔'' صغریٰ نے اپنی زبان میں کہا۔ پھر وہ وہیں پسر کے بیٹھ گئی۔۔ گھر پر کون ساسکھ اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے فیروز سے اپنا دکھ بیان کیا۔

''ہمارا بھی تو بڑا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ جس دن چار پیسے کما لئے بس اس دن سے گھر آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ جب تک ختم نہ ہوں ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ تاڑی پینے کی لت بھی ڈال لی ہے۔ چھوٹے کو مولی صاحب کے ساتھ بٹھایا ہے۔''

مولی صاحب کے پاس بیٹھا کے بھی کیا ہونا ہے ہمارے بچوں کا۔ فیروز نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر چھینی سنبھالی۔ یکا یک اسے کچھ یاد آیا ''خالہ'' اس نے قمیض کی جیب سے دوا کی پڑیا نکالی۔ ''رستے سے حکیم صاحب سے دوا لی تھی۔ ہم تو شام کو پہنچیں گے۔ تم ادھر سے جاؤ تو اپنی بہو کے ہاتھ میں تھما دینا۔ لڑکے کو ذرا جلدی مل جائے گی۔''

''چھوٹا ابھی ٹھیک نہیں ہوا؟'' صغریٰ نے تردد کے ساتھ پوچھا۔

''دوا روز ملے تب نہ۔'' فیروز نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''اس پر بھی تو ابا اتنا بولتے ہیں۔''

مسجد کی پشت سے لگے چلے گئے خستہ حال محلے کے ایک خستہ حال مکان میں فیروز کی بیوی رہتی تھی۔اور چار بچے۔ان میں سے ایک سدا بہار روگی تھا۔ان کے علاوہ فیروز کا باپ تھا جو ساٹھ سال کی عمر میں پچھتر کا نظر آتا تھا۔بے حد بوڑھا۔پتھر کاٹتے کاٹتے اس کے سارے احساسات پتھر ہو چکے تھے۔کہتا تھا چھٹکو کی دوا پر اتنا پیسا کیوں خرچ کیا جارہا ہے۔وہ بچے گا ہی نہیں۔جو تقدیر میں عمر کم لکھوا کے لایا ہو،دوائیں کیا اس کی عمر بڑھا دیں گی؟ بڈھے کو چائے کی لت تھی سامنے ممدو چائے والے کی دوکان سے استعمال شدہ پتی لے آتا تھا۔دن بھر مسجد کے آس پاس گھوم گھوم کر خشک پتے،ٹہنیاں،کاغذ اور انسانوں کو چھوڑ کر باقی ہر وہ شے جو جل سکے اکٹھی کرتا رہتا تھا(انسانوں کو جلانے کا کام زیادہ مہذب اور بارسوخ حضرات انجام دے رہے تھے)تا کہ بہو ایندھن کے خرچ کا گلہ کر کے اسے صلواتیں نہ سنائے۔کبھی کبھی اسے تازہ چائے دودھ اور شکر کے ساتھ مل جاتی تو خدا کا شکر ادا کرتا اور سوچتا تھا کہ جنت تو اسی دنیا میں ہے اور وہ اسے مل بھی چکی۔مولانا آخرت میں جنت کی بشارت دیتے ہیں لیکن نہ جانے کتنی شرطوں کے ساتھ۔انگریزی نہ جانتے ہوئے بھی بوڑھا انگریزی کے اس مقولے پر سختی سے عمل کرتا تھا جس کے مطابق ہاتھ آئی ایک چڑیا جھاڑی میں بیٹھی دو چڑیوں سے بہتر ہے۔چاروں طرف سے کاغذ بٹورتے بٹورتے وہ نیم دیوانہ،سنکی سا دکھائی دینے والا ہوشمند بوڑھا جانتا ہے کہ اس کے حصے میں اور کچھ آنے والا بھی نہیں ہے۔اس لئے الکشن کے زمانے میں ووٹ مانگنے کے لئے آنے والے مقامی نیتاؤں کو جی کھول کر گالیاں دیتا ہے۔

"ارے او بڈھے پرے ہٹ۔" ایک بار ایک نعرے لگاتی بھیڑ کے درمیان گھس گیا تھا بوڑھا۔بھیڑ کچھ پرچے بھی تقسیم کر رہی تھی۔بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ رہے تھے۔متوقع ایندھن نظر آتے ہی بوڑھا اسے دونوں ہاتھوں سے مالِ غنیمت کی طرح سمیٹنے لگا۔"قسم رام کی کھاتے ہیں۔مندر وہیں بنائیں گے۔" کچھ پرچوں پر لکھا ہوا تھا۔کچھ پر لکھا ہوا تھا" مدرسے آتنک واد پھیلاتے ہیں،انہیں بند کرو" کچھ پر لکھا ہوا تھا" گو ہتیا جاری ہے،جس ہندو کا خون نہ کھولے وہ خون نہیں پانی ہے۔"

وغیرہ

''جانو پھر چناؤ ہونے والا ہے۔''چورا ہے پر لیاّ مونگ پھلی بیچنے والے نے بالکل ارسطو کے انداز میں سر ہلایا۔لمبی داڑھی اور پھٹے ہوئے چوغے کی وجہ سے وہ کچھ ویسا ہی لگ بھی رہا تھا۔بھیڑ چھٹ گئی تو اس نے ایک چھوٹے سے ادھ ننگے بچے کے لئے اٹھنی کی لیاّ تولی۔ایک نوجوان لیاّ والے کے قریب آیا،بولا''کہو بڑھو، جئے شری رام''لیاّ والے نے چندھی آنکھوں سے نوجوان کو پہلے گھورا پھر جواب دیا''رام دانے کی لیاّ بیچتے ہیں۔دن بھر میں تم سے زیادہ رام کا نام لیتے ہیں۔جاؤ اپنا رستہ ناپو۔''بھیڑ آگے بڑھ چکی تھی اس لئے نوجوان نے زیادہ حجت نہیں کی۔صرف گالی دینے پر اکتفا کی اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا''کچھ دن بعد دیکھیں گے''اس کا لہجہ سفاک تھا۔لیاّ والا پیسے گننے لگا۔ٹھنڈ کی وجہ سے بچے دبکے ہوئے تھے۔بکری کم ہوئی تھی۔شام تک شاید آٹے اور آلو کے لئے پیسے نکل آئیں۔اللہ مالک ہے۔اللہ پر معاملہ چھوڑ کر وہ دلجمعی کے ساتھ گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔اس وقت اس کا بیٹا رزاق اسٹیشن پر بھیڑ بڑھنے کا انتظار کر رہا تھا اور ایک وزنی جیب کی تلاش میں تھا۔دوپہر سے اب تک وہ صرف ایک جگہ ہاتھ مار سکا تھا۔جو بٹوہ اس نے اڑایا تھا اس میں صرف دس دس کے دو نوٹ اور کچھ ریزگاری تھی۔وہ ہنسا تھا۔''واہ بیٹا واہ۔ہم جیسے ہی نکلے۔ارے دس بیس تو ہماری جیب میں بھی پڑے ہی رہتے ہیں۔مگر یار تب ہم سوٹ بوٹ نہیں ڈانٹتے۔جانے تمہیں کہاں سے مل گیا۔سسرال سے یا کسی مردے کا خیرات میں جو ہم دھوکے میں آ گئے۔''اس نے نوٹ جیب میں رکھے اور بٹوہ پیشاب خانے میں اچھال دیا۔

رزاق کا ایک جگری دوست تھا فضل۔وہ دن میں رکشہ چلاتا تھا اور 'سیزن' میں ہرلالکا روڈ کی''بڑی بی بیوں''کے یہاں طبلے پر سنگت کیا کرتا تھا۔کبھی کبھار گاہک پھنسا کے بھی لے جاتا۔ایک بار پولس کی گرفت میں آ گیا۔چار چوٹ کی مار کھائی تب سے محتاط ہو گیا۔شادی شدہ تھا ایک بیوی اور چار بچوں کا مالک۔پانچویں کی آمد آمد تھی۔بیوی خاصی زبردست تھی۔شام کو آتے ہی جیب خالی کرا لیتی۔اس لئے کبھی

کبھار پولس کو کھلانے میں کوتاہی ہو جاتی تھی۔ آج فضل نے کہا تھا، رات کو چوکڑی جمے گی۔

وہ سب کے سب اکثر قبرستان کے باہر ٹیلے پر اکٹھے ہو جاتے۔ رجب حسین ہاتھی کی قبر پر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ یخ راتوں کے سناٹے میں بانسری کی آواز گونجتی تو سننے والوں کے کلیجے مونہہ کو آجاتے۔ ساری زندگی کی محرومیاں سُر بن کر بانسری سے نکلتیں۔ مجاور کی کڑوے کریلے سی تلخ زبان والی بیوی تک آہ بھر کر کہتی ...... ''گجب بانسری بجاوت ہے ای رجبوا''

نوجوان اس لڑکی کو مٹی کا ڈھوہ دکھا کر کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو یہ کسی شرقی سلطان کے چہیتے ہاتھی کی قبر ہے۔''

''ہاتھی کی قبر؟ واقعی؟''

سٹر پٹر کرتی، شٹل کاک جیسا برقعہ پھڑکاتی مجاور کی بیوی کہیں سے لوٹ رہی تھی۔ لڑکے نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ ہاتھی کی قبر ہے نہ چچی؟''

''ہاں'' وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔ جیسے ہاتھی اس کا رہا ہو یا اس کی کسی تحقیق کے ذریعہ معلوم ہوا ہو کہ اس ڈھوہ کے نیچے ہاتھی دفن ہوا تھا۔ دراصل وہ اس طرحدار نوجوان کے نہایت اپنائیت بھرے لہجے میں چچی کہے جانے سے خوش ہو اٹھی تھی۔ اس نے سرد ہوا سے بچنے کے لئے برقعے کو کس کے لپیٹا۔ اس کی کتھئی رنگ کی میلی اور جگہ جگہ سے مسکی شلوار دکھائی دی۔ خانقاہ نوحہ گراں میں رہنے والی اس عورت کی دنیا ان نہ گنی جا سکنے والی پر اسرار قبروں، سات اولادوں اور دس بیس مرغیوں سے عبارت تھی۔

''ٹھیک سے معلوم ہے نہ؟'' لڑکے کے لہجے میں شرارت تھی۔

''ہم کا نہ معلوم ہو ئیہے؟ ہم یہاں ہمیشہ سے رہت جات ہیں۔'' عورت نے فخر سے کہا۔

''ارے تم انسان ہو کہ بھوت، پلید؟ کبھی مریں نہیں یا مر مر کے پیدا ہوتی رہی ہو۔''

''بھیا مذاک کرت ہیں۔ارے ہم پیڑھی در پیڑھی سے رہت چلے آوت ہیں۔''

لڑکی ہونقوں کی طرح مونہہ کھولے سن رہی تھی۔لیکن وہ بور قطعی نہیں ہو رہی تھی۔لہجہ اجنبی، زبان نا قابل فہم، لیکن کہیں کوئی مٹھاس تھی، ایک معصومیت کے ساتھ۔

اچانک عورت کی توجہ ان لوگوں کی طرف سے یکسر ہٹ گئی۔وہ زور سے چلائی ''ارے محمد صدیک، ہے محمد صدیک'' پھر وہ اپنی زبان میں بڑبڑاتی، مکان کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی۔وہ طرح دار لڑکا اور فرنگی لڑکی، دونوں اس کے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔

محمد صدیق اس کا منجھلا لڑکا تھا جو اس کے خیال میں رزاق کے ساتھ رہ کر خراب ہو رہا تھا۔اس وقت بھی اس نے ماں کے چلانے کی چنداں پرواہ نہ کی اور چوروں کی طرح سٹک لیا۔ویسے ابھی تک وہ 'خراب' نہیں ہوا تھا۔رزاق اسے اٹھائی گیری کی تربیت دینا چاہ رہا تھا۔ہاتھی کی قبر کے برابر والے ٹیلے پر جب پچھلے ہفتے وہ سب تن پتیا کھیلنے بیٹھے تھے تو رزاق نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ساتھ'' نکلا' کرے۔صدیق جمعے کی نماز میں پابندی سے جاتا تھا۔مولانا صاحب کا وعظ بہت غور سے سنتا تھا اور دوزخ سے خاصہ خوفزدہ رہتا تھا۔اس نے رزاق کی تجویز پر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''یار تو کیا کرتا پھرتا ہے۔پکڑا گیا تو؟''

''مفت کی ملے گی جیل میں۔''

اور ڈنڈے جو پڑیں گے؟''

''وہ بھی کھالیں گے روٹیوں کے ساتھ۔''

''یاد نہیں انتظار کو پولس پکڑ کر لے گئی تھی۔وہ کبھی واپس نہیں آیا'' صدیق نے دھیرے سے کہا۔دوزخ کے ساتھ ساتھ صدیق پولس سے بھی ڈرتا تھا۔

انتظار آتش باز تھا۔بڑا نہیں، چھوٹا موٹا سا۔بس ایک کوٹھری بھر 'ورک شاپ'

تھی اس کی۔ اس پر الزام تھا کہ آتش بازی کی آڑ میں بم بناتا تھا اور شہر میں ہندو مسلم دنگے کی سازش کے دوران اس نے بم سپلائی کئے تھے۔

''ہو۔ہو۔ہو۔ بڑی سردی ہے۔'' رزاق نے انتظار کے بارے میں اپنی سوچ پر عرصہ ہوا کہ پہرے بٹھادئے تھے۔ وہ انتظار کا بچپن کا دوست تھا اور اس کی زندگی کے ہر راز میں شریک۔ انتظار کے گھر میں دال میں بگھار لہسن سے لگایا گیا یا صرف زیرے مرچ سے یہ اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ اسے معلوم تھا انتظار نے بم نہیں بنائے تھے۔ پرلے محلے میں سکینہ آج بھی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ مگر رزاق کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ اس لئے اس نے بات کا رخ پھیرا۔

''ہو۔ہو۔ہو بڑی سردی ہے۔''

''یہ تم لوگوں کو اتنی سردی کیوں لگتی ہے؟'' برکت تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آن بیٹھا۔ ''چوکڑی جمی ہے۔''

''تمہیں نہیں لگتی؟ مرغیوں کا شوربا پی کے گرمائے رہتے ہو۔''

''ابے ہمارے نصیب میں کہاں شوربہ۔ بیس روپے میں ہوٹل والے کو بیچ دی تھی۔ روپے اماں نے جھپٹ لئے۔ دال خرید کے لائیں۔ نصیب میں وہی لکھی گئی دال روٹی۔''

''پھر بیٹا، تاڑی کہاں سے لائے؟''

''ایک اور کے بیس مل گئے تھے۔''

''ہوا نہ یہ شوربہ یا وہ شوربہ۔ مگر تو بن رہا ہے۔ سردی کے مارے روئیں صفا کھڑے دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے برکت کی پیٹھ پر ایک دھول جڑی۔

''چلو آگ تاپیں۔'' برکت نے سپر ڈال دی۔ اب تو اس کے دانت بھی بجنے لگے تھے۔ ہوا میں غضب کی کاٹ تھی۔

''یہاں تو کچھ ہے نہیں کاہے سے تاپو گے؟''

''دیکھتے جاؤ۔'' وہ اٹھ کر پھاٹک تک گیا کمزور لکڑی کا پھاٹک دو چار دھکوں میں چرمرانے لگا تھا۔ صدیق بھی شامل ہو گیا۔ رزاق برکت اور رجب حسین نے

مل کے قبضے الگ کیے۔ پھر پھاٹک کو کھینچ کے ہاتھی کی قبر تک لے آئے۔ رجب نے دونوں ہاتھ مونہہ پر رکھ کر ہانک لگائی ''ابے شہزادے، او شہزادے ہو...او، او...دور بیٹھ کر پتے کھیلتے نوعمر لڑکوں میں سے ایک دوڑتا چلا آیا۔

''کیا بھائی جان؟''

''چل بلا لے اوروں کو بھی۔ اور ذرا پتے بٹور کے لا سوکھے۔''

لونڈے مل کے پتے بٹور لائے۔ کچھ کاغذ کے ٹکڑے اور گتے کا ایک آدھ ڈبہ بھی۔ رزاق نے جیب سے ماچس برآمد کی۔ تھوڑی ہی دیر میں پھاٹک عظمت رفتہ کی چتاؤں کی طرح دھو دھو کرتا جل اٹھا۔

اندر شاہان شرقیہ محو خواب تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں ان کی سلطنت قنوج سے بنگال تک پسری پڑی تھی۔ باغیوں کی سرکوبی کرتے وقت ان کی افواج خون کی ندیوں میں چھپ چھپ کیا کرتی تھیں اور جب وہ پرسکون ہوتے تو مسجدیں اور قلعے تعمیر کرتے، شہر بساتے، عالموں اور مصنفوں کو نوازتے اور بڑے بڑے علمی، فنی (اور متفنی) اور جنگی دماغوں کی پرورش کرتے۔

قبرستان کا پھاٹک خاصہ وزنی تھا۔ لڑکوں نے خوب ہاتھ تاپے تھے۔ اور پتے پھینٹتے پھینٹتے صبح کر دی تھی۔ آذان کی آواز بلند ہوئی تو کچھ مسجد کی طرف بھی بڑھ لئے تھے۔

''حرامی کے پوت'' صغریٰ نے پھر پلٹ کر دوبارہ دانت بھینچے۔

شام اب گہرانے لگی تھی۔ ہوا کی خنکی میں برف کے چھروں کی کاٹ تھی۔ وہ دونوں جامع الشرق سے متصل قبرستان سے باہر آگئے تھے۔ دو پرانی اور آوارہ روحوں کی طرح۔ جامع الشرق کے آنگن میں اب سناٹا تھا۔ مولی صاحب اور بچے کب کے جا چکے تھے۔ فرنگن کو بنارس کی بس پکڑنی تھی۔ بس اڈے تک چھوڑنے لڑکا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ اس خوبصورت کٹ جحت لڑکی کی صحبت نہایت فرحت بخش رہی تھی۔

خدا حافظ کے ساتھ فرنگن نے کہا۔

''اور کچھ مانو، نہ مانو یہ تو تمہیں ماننا ہی پڑے گا کہ تمہارے دماغوں سے بوئے سلطانی نہیں جاتی۔''

لڑکے کے ذہن سے وہ سارے شریر، رومانی جملے غائب ہو گئے جو وہ چلتے وقت کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کی شرارت سے ناچتی پتلیاں یکلخت اداس ہو اٹھیں... ''اور تمہارے متعفن دماغوں سے بہت سارا کچرا۔'' اس کی آنکھوں میں شرارے ناچے اور اس نے کہنا چاہا لیکن وہ گونگا ہو گیا تھا۔ بس دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی اور فرنگن کا ہلتا ہوا ہاتھ دور ہوتا جا رہا تھا۔

فضلو بابائے تخ

صدیوں پہلے کی بات ہے یا کم از کم ایسا لگتا ہے کہ بچپن گذرے صدیاں بیت گئیں۔ تب میں اپنے بزرگوں کی گود میں گھس کر کہانیاں سنا کرتی تھی۔ والد کے پرانے دوست اور کلاس فیلو' شمسی چچا، پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ (اب مرحوم و مغفور) ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے سر پر سوار ہوگئی۔ ''چچا، کہانی'' والد اپنی روداد سنانے میں مشغول تھے، جھنجھلا کر بولے ''دفع ہو، شیطان کی خالہ۔ ہر وقت کہانی...'' شمسی چچا ہنسنے لگے۔ بولے تمہاری بیٹی ہے بات منوائے بغیر ٹلے گی نہیں۔ اس کی فرمائش پوری کر دیتا ہوں۔ پھر اطمینان سے گپ ہوگی۔

میں ان کی لانبی چوڑی میدان جیسی گود میں باقاعدہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

''سنو! ایک پہلوان تھا۔ نام تھا امیر و خاں طمیر و خاں، لنگڑ چمر چا خا خاں، چی وئی وئی۔ اب اگر تم اس نام کو دوہرا دو تب تو کہانی آگے سناؤں گا ورنہ تم فیل اور کہانی ختم۔''

میں نے جلدی جلدی ہانپتے کانپتے دوہرایا... ''امیر و خاں، طمیر و خاں لنگڑ چمر

چاخاخاں، چی وئی وئی''

''واقعی شیطان کی خالہ ہے۔'' وہ زور سے ہنسے۔ گودی میں بھونچال آ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں فضلو بابا ٹخ ٹخ کے ابکے میں بیٹھ کر شرافت چچا کے گاؤں جا رہی ہوں اور ایکہ الار ہو گیا ہے۔

''اچھا بھئی چلو۔ ہم شرط ہار گئے۔ اب آگے کی کہانی سناتے ہیں۔''

''ایک بہت بڑا میدان تھا۔ ہرا بھرا اور شاداب اس کے بیچوں بیچ ایک ہزار میل چوڑی ندی بہتی تھی۔ ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ کنارے اگے درختوں میں رنگ برنگی چڑیاں رہا کرتی تھیں۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے جانور ٹہلتے پھرتے تھے۔ اس ندی کے ایک کنارے وہ رہا کرتا تھا، ارے وہی ...... امیرو خاں طمیر و خاں...... غلاموں کی بہت بڑی فوج اس کے پاس تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ایک اور پہلوان رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا آلتو خاں فالتو خاں چڑاتے خاں مارتے خاں دونالی خاں بے دھڑک......'' بے دھڑک انہوں نے زور سے ادا کیا۔

میں نے قدرے سہم کر ابا کی جانب دیکھا ان کے چہرے پر بے زاری کے آثار تھے۔ کہانی جاری تھی:

''امیرو خاں طمیر و خاں رات کو اپنی روٹی خود پکاتا تھا۔ جب وہ ہاتھوں پر روٹی بڑھاتا تو اس کی تھاپ ایک ہزار میل چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر آلتو خاں فالتو خاں کے گھر پہنچتی تو اطراف میں بسے لوگوں کے دل دہل جاتے۔ پیڑوں پر بسیرا کرتی چڑیاں بے چین ہو کر اڑنے لگتیں اور شیر اپنی ماندوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔''

''پھر؟''

میں نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''پھر اس کے جواب میں آلتو خاں فالتو خاں اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور دوسرا ہاتھ بھرے پیٹ پر پھیر کر ڈکار لیتا...... غاؤں ۔۔اوؤں ۔۔اوں ۔۔اس کی رانیں پیٹنے اور ڈکار لینے کی آواز ایک ہزار میل چوڑی ندی کے پانیوں پر سے گذر کر

دوسرے کنارے پہنچتی اور راستے میں ملنے والے سارے پنکھ پکھیرو آدمی جانور بے چین ہو جاتے۔ کئی سو سالوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔

''یہ دونوں کشتی لڑکر خود فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟'' گاؤں کے کچھ نیک بزرگوں، پنکھ پکھیروؤں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں نے کہا۔ ''ہمارے دل کیوں دہلاتے رہتے ہیں؟''

''جب جی چاہتا ہے اپنے غلاموں کو بھیج کر ہمیں پکڑوا لیتے ہیں۔'' ایک سفید بالوں والے خرگوش نے کہا۔

''ہمارے گھاس کے میدانوں میں آگ لگا کر اپنی روٹیوں کے لئے گیہوں اگاتے ہیں۔'' ہرن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

بزرگوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''ہم سمجھا بجھا کر ہار گئے، ہمارا ان پر کوئی زور نہیں۔''

اور شاید حالات پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ اسی وقت چچا زوار حسین نازل ہو گئے اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ضرور مارتے خاں بے دھڑک انہیں کی صورت کا رہا ہوگا۔ ابا اور شمسی چچا ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں شدید کوفت کے ساتھ اندر سٹک گئی۔ کہیں چچا زوار حسین رانوں پر ہاتھ مار کر، پیک کے چھینٹے اڑا کر پھر اپنا وہی پرانا قصہ نہ شروع کر دیں جس سے ایڑی میں لگتی اور چوٹی میں بجھتی۔

''اری بٹیا تو پھر نقل کر کے کلاس میں فرسٹ آ گئی؟''

اس وقت کہانی میں یہ اڑنگا لگا کہ کہانی ادھوری رہی تو رہ ہی گئی کیونکہ شمسی چچا دوسرے دن واپس لکھنو چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی ٹیڑھی کبڑی تحریر میں انہیں خط لکھا کہ وہ کہانی پوری کر دیں۔

''کہانی کہیں خط میں لکھی جاتی ہے بے وقوف۔ کہانی تو آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ اسے پکڑوں تو سناؤں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

بعض واقعات کہیں گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں جیسے اس کہانی کا ادھوراپن جو آج بھی پھانس بن کر دماغ میں گڑا ہوا ہے۔ اور اب... اب جبکہ میں خود آس پاس

گھومتی کہانیوں کو پکڑ پکڑ دوسروں کو سناتی رہتی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس کہانی کو بھی خود ہی مکمل کر کے اپنے آپ کو سنا دوں تا کہ میرے اندر جو ننھی بچی چھپی بیٹھی ہے وہ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔

بچی ابھی شرافت چچا کے بھیجے ہوئے گنے چوسنے میں مصروف ہے۔

''فضلو... اے فضلو، ہمیں ایک چکر دلا کر لاؤ۔'' گنا ختم کر کے وہ فضلو بابا کی آستین پکڑ کر اچھلنے لگتی ہے۔ جو گھوڑے کی لگام پکڑے، اس کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ارے بٹیا سوجھے (سیدھی طرح) بیٹھو۔ ابھی جائے کو ہے پانچوں پیرن۔ ڈاکٹر تاراچرن کی ماتاجی منت مانے رہیں۔ سو جات ہیں چدر لے کے۔''

''ہم بھی چلیں فضلو بابا؟''

پانچ مونگی مونگی مہرارو ہیں سب جوڑ کے۔ تم کہاں بیٹھیو بٹیا؟'' وہ اکے سے شکر قند کی ٹوکری اتارتے ہیں جو گنوں کی پھاندی کے ساتھ آئی تھی۔ '' ہنے لیو، کھاؤ بھونج بھونج کے۔ سراپھت کے کھیت کی گنجی (شکر قند) بڑی میٹھ ہوت ہے۔'' وہ دوبارہ اکے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ...

''فضلو بابا ٹخ ٹخ... فضلو بابا ٹخ ٹخ۔'' محلے کے دو چار لڑکے تالیاں بجاتے یکے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ان میں موٹا بے وقوف پریم چند لوہیا سب سے آگے ہے۔ پیچھے سے اسمٰعیل جو اسمٰعیل پگلا کہلاتا ہے، اسے ٹہوکا دے رہا ہے۔

''اچھا بچو ------'' فضلو بابا پریم چند کی طرف مصنوعی غصے سے چابک لہراتے ہیں۔ ''اب کے جیہو سگرا کے میلہ۔'' پریم چند کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شہر سے پانچ میل دور سگرا کا میلہ لگا کرتا تھا۔ لوہیا کنبے سے فضلو کا پرانا ربط ضبط تھا۔ اس لئے ان کا اکہ پہلے سے ان لوگوں کے لئے بک رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس چھوٹے سے شہر سلطان پور اودھ میں لوگ باگ چار پانچ کوس کے لئے یکہ تانگا ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ فضلو کی گھوڑی ہمیشہ صحت مند اور چاق و چوبند رہتی تھی اور یکہ درست۔ اس لئے ان کی سواریوں کا حلقہ شہر کے خواص پر مشتمل تھا۔

''ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ...اسمعیل کو سگرا کے میلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لئے وہ چڑائے جا رہا ہے۔''فضلو بابا ٹخ ٹخ...''

''اس کمبخت فضلو کو ٹخ ٹخ کا میگیا ہے۔(تائی اماں میںیا **Mania** کو میگیا کہا کرتی تھیں)'کوس بھر بھی چلو تو ٹخ ٹخ سنتے سنتے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔پھر وہ کب سواری سے بات کر رہا ہے،کب رام پیاری سے،یہ سمجھنا بھی اکثر مشکل ہی ہوتا ہے۔''

بڑی اماں،طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟''

''طبیعت کمبخت کیا ٹھیک رہے گی۔اس بلڈ پریشر کا ستیاناس ہو،لگتا ہے لے ڈوبے گا۔''تائی اماں پردے کے پیچھے سے تفصیل بتانے لگتی ہیں کہ جانا ضروری تھا ورنہ گھر سے نہ نکلتیں۔''اس وقت بھی سر بھاری ہو رہا ہے۔''

''کا ہو،آج سیر ے سیر ے گھاس ناہیں کھائے رہیو کا ٹھیک سے؟''

''ارے کمبخت فضلو،میں گھاس کھاتی ہوں؟ ستیاناسی،تیرا بیل کا مونہہ ہو۔''تائی ماں ہتھے سے اکھڑ جاتیں۔

''ہم تو رام پیاری کو کہت رہیں بڑی اماں۔''فضلو بغیر شرمندہ ہوئے آرام سے جواب دیتے ہیں اور یکا یک یکہ روک کر اتر جاتے ہیں۔

''ستیاناس!اب کیا ہوا؟اس رام پیاری کی ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟''

''دیکھو بڑی اماں'رام پیاری کو کچھو نا کہو۔ہم کا گریلیو جتنا من ہوئے۔''

''ارے مردود،میں کیا گالیاں بکتی ہوں جو تجھے گالیاں دونگی اور یہ تیری گھوڑی آسمان سے اتری ہے کیا جو اسے کچھ نہ کہوں؟ایسے چل رہی ہے جیسے آدھی مر گئی ہو۔''

''ایکہ چلاتے چلاتے اس کی شکل خود گھوڑی جیسی ہوتی جا رہی ہے۔''ایک بار کسی بات پر فضلو نے تھوتھنی جیسا مونہہ لٹکایا تو کم سخن اماں بھی بے اختیار بول پڑی تھیں۔اس وقت تائی اماں کی سرزنش پر اس نے پھر ویسا ہی مونہہ بنایا۔رام پیاری کے لئے تحقیر آمیز الفاظ اس کی برداشت سے قطعی باہر تھے۔

''رام کھلاون کا کا سے لئے رہیں۔ کہے لگیں کہ بٹیا کا بیاہ نا کرے کو ہوتا تو نا پچھتیں۔کھول کردئے لگیں تو آنکھ ماں آنسو۔بولیں کے بیٹا پھجلو تو توای کا نام بدل دیہو۔تمہار کا کا بڑے پریم سے رکھے رہیں، رام پیاری، ہمری پہلوٹھی کی بٹیا کوئی دو مہینا کی ہوئے کے گجر گئی رہی، اوہو کا نام رہا رام پیاری۔تو بڑکی اماں ہم کہیں کہ ہم نام کا ہے بدلیں گے۔کون جرورت ہے نام بدلے کی۔نام تو بڑا ایک ہے۔''

''دوئی تمہاری یہ داستان کبھی ختم بھی ہوگی۔نوسویں بار دہرار ہے ہو۔ذرا دو چار چابک رسید کروا پنی اس نو پھول راج کماری کو تاکہ ذرا تیز چلے۔''

''کچھ ناراج ہیں کا؟'' فضلو کا لہجہ ریشم کی طرح نرم تھا۔

''نہیں میں ناراض نہیں ہوں مگر...'' بڑی اماں پگھل گئیں۔

''آپ کا ناہیں کہت رہے بڑکی اماں، رام پیاری سے پوچھت رہیں۔پانچ ٹھو روپیہ دتیجئے گا؟''

خون تائی اماں کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔مارے غصے کے خاموش ہوگئیں۔ویسے بھی فضلو کی اودھی ان کے پلّے پوری طرح پڑتی نہیں تھی۔وہ مرادآباد کی تھیں۔''بڑکی اماں پانچ ٹھو روپیہ نا دیہیں؟ کون بڑی بات ہے آپ کے لئے؟''

''ارے مجھ سے کہہ رہا ہے جنم جلے؟ مجھے کیا پتہ کہ مجھ سے مانگ رہا تھا یا وہ بھی اس گھوڑی سے ہی کہہ رہا تھا''

''آپ سے کہت رہیں بڑکی اماں۔'' نہایت ملائمیت اور سادگی سے فضلو نے جواب دیا۔

''کیا کروگے پانچ روپے۔''

اس زمانے میں پانچ روپے ایک غریب آدمی کے لئے اچھی خاصی رقم تھی۔

''ابھی تو ہم تین گاہکی لوگن سے پانچ پانچ روپیہ...''

''ایک اور شادی کر رہا ہے کیا؟''

ہاہاہا... فضلو دوسری شادی کے مذاق پر جی کھول کر ہنسے۔پھر انہوں نے بتایا کہ دیوالی آرہی تھی اور لڑکے پٹاخوں کی ضد کر رہے تھے۔لائی، بتاشے، کھیلیں تو کئی

جمان دیتے ہیں لیکن پٹاخوں کے لئے تو پیسہ چاہئے۔

''اچھا لے لینا پیسہ، چھڑا لینا پٹاخے۔مگر کل ذرا ایک بجے ضرور چلے آنا۔ شرافت کے گاؤں جانا ہے۔سب لوگ چلیں گے۔''

فضلو سے تائی اماں کی چخ ہمیشہ چلتی رہی لیکن پھر بھی کہیں جانا ہوتا تو انہیں کو بلاتیں۔بقول تائی اماں جب کہیں جانا ہوتو ڈھینگ کے ڈھینگ لڑکوں کی خوشامد کرو کہ اے بیٹا ذرا فلاں جگہ ساتھ چلے چلو پھر بھی دسیوں بہانے گڑھیں گے، ہزار نخرے دکھائیں گے۔کبھی راضی ہونگے کبھی اس کے باوجود نہیں ہونگے۔فضلو سے کہلا دیا وہ آ گیا وقت سے۔اب کسی سپہ سالار کی ضرورت نہیں کہ ساتھ چلے۔ اطمینان سے دور نزدیک جہاں چاہو جاؤ، ڈاکٹر کے یہاں گھنٹوں کھڑا رکھلو۔ یہ رشتہ اس وقت بھی قائم رہا جب رام پیاری مرگئی اور فضلو بابا رکشہ چلانے لگے۔ان کے اکّے کی طرح ان کا رکشہ بھی کبھی اسٹینڈ پر جا کر نہیں لگا۔وہ محلے کے 'لگے ہوئے گاہکوں' کے یہاں کام کرتے تھے۔رکشے میں آگے لکڑی کی بنچ لگا کر اب وہ ان لگے ہوئے گھروں کے بچوں کو اسکول بھی لے جانے لگے تھے۔ہاں یہ اسکول والا کام پکڑنے کی وجہ سے کبھی کبھی تائی اماں کو دقت ہو جایا کرتی تھی۔پچھلی مرتبہ انہیں ظہر کے بعد بلایا تھا، وہ عصر بعد ہانپتے کانپتے وارد ہوئے تو تائی اماں کا بلڈ پریشر کافی بڑھ چکا تھا۔ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔

''ارے بڑکی اماں ہمری او سنیو کی ناہیں۔بولت جات ہیں، بولت جات ہیں'' وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔پھر انہوں نے داستان سنائی کہ ان کے رکشے پر شہر میں نئے آئے ہوئے سول انجینئر اجے کمار کی بچی بھی اسکول جاتی تھی۔وہ اس کے گھر پہنچے تو دیکھا گھر میں تالا۔اس کی نوجوان ماں پڑوس میں کہیں جا بیٹھی تھیں اور دھیان سے اتر گیا تھا کہ سنیچر کو ہاف ڈے کی وجہ سے بچی تو بارہ بجے ہی گھر آ جائے گی۔فضلو کھونٹے کی طرح وہاں جم کر بیٹھ گئے۔گرچہ باہر لان اور چھوٹا سا باغیچہ تھا اور ملازم سوکھے پتے صاف کر رہا تھا۔بچی کی ماں واپس آئیں تو بچی کو انہیں سونپ کر ہی فضلو اٹھے اور باقی بچوں کو ان کے گھر پر پہنچایا۔چلتے وقت اجے کمار کی بیوی کو

لمبا لکچر بھی پلایا کہ اس طرح گھر سے غائب نہ ہو جایا کریں۔ ملازم پر بچی کو نہ چھوڑیں۔ اسکول کے نظام الاوقات اچھی طرح یاد کرلیں وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ بوڑھے ہونے کے بعد فضلو بابا اور تائی اماں، دونوں میں اور بھی بے میل خواص پیدا ہو گئے تھے۔ تائی اماں بے صبر اور چڑچڑی ہو گئیں تھیں اور فضلو سست رفتار، موڈی اور بکی۔ اس دن تائی اماں خوب ہی تو ناراض ہوئیں۔ مارے غصے کے اپنا پروگرام ہی کینسل کر دیا۔

پھر رام پیاری کی طرح ایک دن وہ بھی فضلو بابا کی زندگی سے خارج ہو گئیں۔

تیجے کے دن سب نے کھانا کھایا لیکن فضلو اپنے برتن سرکا کر یونہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچی زمین پر ان کے آنسوؤں کا گول نشان دیر تک گیلا رہا۔

پھر فضلو بابا کے شانے اور بھی ڈھلک گئے اور قویٰ کمزور ہو گئے۔ اب ان سے رکشہ بھی نہیں چلتا تھا۔ وہ بازار میں ترکاری کا ٹھیلہ لگانے لگے تھے۔ گردن جھکائے چپ چاپ سبزیاں تولتے رہتے۔ ایک بیٹا تھا جو کب کا بمبئی بھاگ چکا تھا۔ سنا وہاں درزی کا کام کرتا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں تینوں کے بیاہ ہو چکے تھے۔ بیوی کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک اکیلا پیٹ پالنے میں ایسی دقت نہ ہوتی لیکن کچھ عرصہ پہلے ایک داماد ان کی بیٹی کو مار پیٹ کر ان کے گھر چھوڑ گیا۔ اب اس کا پیٹ تو پالنا ہی تھا۔ بیٹی بیڑیاں بناتی تھی پھر بھی انتہائی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اکثر سبزی تولتے تولتے ہاتھ روک کر خلا میں تکنے لگتے اور دھیرے دھیرے بدبداتے ''ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ سنبھل کے بیٹا رام پیاری، سنبھل۔کے۔'' شاید وہ اس عہد زریں میں واپس لوٹ جانا چاہتے تھے جب ان کے قویٰ مضبوط تھے، ان کے بال بچے ان کے سائے میں محفوظ تھے اور رام پیاری ایک ماں بن کر ان کی کفالت کر رہی تھی۔

یا وہ محض سٹھیا گئے تھے؟

لیکن مجھے کیا ہو گیا؟ میں تو فضلو بابا جتنی بوڑھی نہیں ہوں۔ نہ میرے بال سفید ہوئے ہیں، نہ دانت ٹوٹے ہیں اور نہ ہی میری مت ماری گئی ہے۔ میں تو یر وخاں، طمیر وخاں، اور مارتے خان بے دھڑک کی کہانی سنانے جا رہی تھی جو خوف و دہشت

پیدا کرتے اور قبروں پر اپنا راج سنگھاسن جماتے ہیں۔ یہ فضلو بابا کہاں سے درمیان میں آگئے؟ میں بھی سٹھیا گئی ہوں کیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے عادت ہے ان لوگوں کی کہانی سنانے کی جنہیں میں بہت قریب سے جانتی ہوں اور جن سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور جن کی کہانیوں کو میں اختتام تک پہنچا سکتی ہوں۔ امیروخاں طمیروخاں تو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی داستان کے کردار ہیں شاید اسی لئے شمسی چچا بھی اسے اسے کبھی پورا نہ کر سکے۔

لیکن ٹھہرئے۔ فضلو بابا کی کہانی میں بھی کیسے ختم کروں؟ ان سے ملے زمانہ گذر گیا۔ تین برس ہوئے کہ میں وطن نہیں گئی ہوں۔ وطن جسے عورتیں اپنی زبان میں مائکہ کہتی ہیں اور جو انہیں بہت عزیز ہوتا ہے۔ لیکن کہانی تو مکمل کرنی ہے۔ میں گیارہ بجے رات کو ٹرنک کال کرتی ہوں۔ میرا بھتیجہ فون اٹھاتا ہے اور اتنی رات کو میری آواز سن کر گھبرا سا جاتا ہے۔

''پھپھو، کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نہ؟''

''ہاں بھیا ابھی تک تو ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آج کل خیریت سے ہیں۔''

''فون کیوں کیا پھپھو؟''

''سنو وہ جو تھے فضلو بابا ٹخ ٹخ... میرا مطلب جنہیں بچے ٹخ ٹخ کہہ کر چڑاتے تھے وہ آج کل کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟''

وہ اچانک خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر ذرا رک کر کہتا ہے ''یہ گیارہ بجے رات میں آپ نے فضلو پگلے کا حال جاننے کے لئے فون کیا ہے؟''

''ارے بھئی سوال مت کرو، میرے سوال کا جواب دو۔''

وہ ایک طویل سانس کھینچتا ہے۔ ''آپ کو معلوم ہے پھپھو۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی بدایوں میں تھی۔ وہ اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پچھلے سال زچگی میں وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ داماد کا خط آیا تو فضلو بے وقوف قرض ادھار لے کر بدایوں کے لئے روانہ ہو گیا۔ فضا ان دنوں بھی ایسی ہی خراب تھی۔ بدایوں اسٹیشن پر جو مسافر

اردو کے نام پر ٹرین سے کھینچ کر مار دیے گئے ان میں فضلو بھی تھا۔لاش بھی گھر نہ آسکی۔اور کچھ پوچھنا ہے بڑی پھپھو؟''

میں بغیر جواب دیئے خاموشی سے رسیور رکھ دیتی ہوں۔ایک دبلا پتلا جھکے ہوئے شانوں اور جھریوں بھرے شفیق اور مہربان چہرے والا بوڑھا نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ضرور اس کی حیران و پریشان روح آسمانوں کے درمیان چکراتی، گھومتی ہوگی اور پوچھتی ہوگی ''ہم کا کاہے ماریو بھیا؟ ہم کا بگاڑے رہیں تہار؟''

بجھے دل کے ساتھ برش اٹھا کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔سونے سے پہلے بال سمیٹ کر ایک چوٹی گوندھ لینا میری عادتوں میں شامل ہے۔لیکن یہ کیا۔اچانک آئینے سے میرا چہرہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ شانوں پر فضلو بابا کا چہرہ اگ آتا ہے۔دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور برش ہاتھ سے گر جاتا ہے۔

ندی کے پانی میں تلاطم ہے، پنکھ پکھیرو بے چین ہیں' اور خرگوش' ہرن اور میمنے خوف زدہ۔

تھوڑا سا کاغذ

ممدو کباڑی نے اپنا ٹھیلہ لا کر ٹھیک صدر دروازے کے پاس لگایا تو معظم کو معاً خیال آیا کہ آج اتوار تھا کیونکہ ممدو اتوار کو ہی آیا کرتا تھا۔

''آ گئے ممدو؟'' اندر سے معظم کی بیوی تاجور نے ذرا زور سے پکار کر کہا اور پھر خود بھی باہر آ گئی۔

''دیر لگے گی''

''معلوم ہے'' ممدو کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ موت کے احترام میں پیدا ہونے والی سنجیدگی۔ وہ معظم کے والدین کے وقت میں ایک نوجوان' مسیں بھیگتا ہوا' لڑکا تھا اور معظم کی سب سے بڑی بہن ریشماں سلطان عرف ریشم کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوا تھا۔ ہر دو تین ماہ پر کسی اتوار کو اپنا ٹھیلہ لے کر آ کھڑا ہوتا۔ تاجوران دو تین مہینوں کی ردی نکالتے وقت اچھی طرح دیکھ لیتی تھیں کہ پھوپی کا کوئی پرچہ اس میں نہ چلا جائے۔ پھر بھی ممدو کی آواز سن کر پھوپی چیل کی طرح وہاں پہنچ جاتیں اور ایک ایک کر کے ساری ردی کھنگالتیں کہ کہیں ان کا کوئی رسالہ' کوئی کتاب یا مطلب کی کوئی اور چیز اس میں نہ چلی گئی ہو۔ کبھی کبھی وہ اخبار کے تراشے بھی نکال کر رکھ لیا کرتی تھیں۔ مضمون تراشنے کا موقع نہ ملتا تو اخبار ہی تہہ کر کے الگ رکھ دیتیں۔ ایسے تراشوں کی نہ جانے کتنی فائلیں تھیں ان کے پاس۔ وہ ردی کے پاس پھیل کر بیٹھ جاتیں تو منہ چڑھا ممدو جھنجھلاتا۔ تاجور دبی دبی

ناراضگی کا اظہار کرتیں لیکن جب تک پھوپی ساری ردی دیکھ کر اطمینان نہ کرلیں تب تک وہ ممدو کی ترازو پر چڑھ نہیں پاتی تھی۔

ملازم بازوؤں میں بھر کر ایک بھاری بوجھ لے کر آیا اور ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ زمین پر پٹخا۔ ''تہذیب الاخلاق'' معظم وہاں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک دو شمارے اٹھائے۔ کرم خوردہ' زرد صفحے۔ ہاں کیا کرنا ہے ان کا۔ ذہن نے خاموشی سے دوہرایا۔

دوسرا گٹھر۔ آج کل

تیسرا، بیسویں صدی

چوتھا، شب وخون

پانچواں، نقوش

مختلف صوبائی اکادمیوں کے ذریعہ نکالے جانے والے پرچے' خواتین ڈائجسٹ مذہبی رسالوں کی فائلیں۔ دین دنیا' آستانہ' الحسنات۔

بچوں کے رسالے 'کھلونا' کی بیس پچیس سال کی مکمل فائلیں، ایک اور بڑا گٹھر۔

''پھپھو آپ کی ردی بکے تو ہم دونوں کا یہاں سے دلی تک کا ہوائی جہاز کا کرایہ نکل آئے۔'' معظم کی چھوٹی بیٹی عنبریں نے جو پھپو کی لاڈلی تھی' ایک مرتبہ کہا تھا۔

پھپو ناراض نہیں ہوئیں۔ مسکرا کر بولیں ''دلی جا کر کیا کرو گی بیٹی؟''

''کچھ بھی کریں۔ ہوائی جہاز پر مفت میں چڑھ تو لیں گے۔ امی تو کرایہ دینے سے رہیں۔''

''میری کتابوں کو ردی کہتی ہو؟'' پھوپی کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرتی تھیں

''اور نہیں تو کیا۔ باوا آدم کے وقت کی کتابیں۔ سن ۴۵ء تک میں چھپے ہوئے رسالے۔ چلئے سال دو برس پرانے رکھ بھی لئے لیکن سن پینتالیس۔''

''یہ ابا کے وقت کے ہیں بیٹا۔ وہ پابندی سے لیا کرتے تھے۔ ہم نے سنبھال کر رکھ لئے۔''

اٹھارہ سو پینتالیس کے پھوپی؟'' بڑی بیٹی نوشیں نے لقمہ دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''اٹھارہ سو پینتالیس میں ہماری پھپھو نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ ایشیا کی پہلی عظیم خاتون ہیں جنہوں نے اتنی تعلیم حاصل کی۔'' نوشیں نے بالکل کسی نیوز ریڈر کے انداز میں بیان کیا۔

''اٹھارہ سو پینتالیس۔ ارے میں اتنی پرانی روح ہوں؟ انسان ہوں یا بھوت پلید؟'' وہ زور سے ہنسیں۔'' ''آپ ہماری ریشم پھپھو ہیں۔'' دونوں ان کے گلے میں جھول گئیں۔'' بھوت پلید ہوں آپ کے دشمن۔''

''چپو کٹنیو! بات تو مانتی نہیں۔ بس جھوٹ موٹ کا کٹنا پا۔''

''کیا بات نہیں مانتے پھپھو۔ کہہ کے تو دیکھئے۔''

''اردو کیوں نہیں پڑھتیں؟''

''پڑھتے تو تھے!''

''پڑھتے تو تھے اپنا سر۔ کچھ مہینوں تک گھنٹہ آدھا گھنٹہ بیٹھ کر مولوی صاحب کے ساتھ ریں ریں کر لیا تھا۔ میرے پاس بیٹھ کے پڑھو۔ دیکھو بیٹا۔ اتنی اچھی اچھی کتابیں اس آبنوس کی الماری میں بھری ہیں۔ تمہارے دادا کی چھوڑی ہوئی اچھی خاصی لائبریری ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔'' بھاگ لو یہاں سے۔ چالو ہو گئیں پھپھو۔''

آنکھوں نے کہا'' وہ تو درست ہے لیکن اب یہ سب کون پڑھے گا۔'' ایک مرتبہ معظم نے دبی زبان سے کہا تھا۔'' داستان امیر حمزہ' داستان چہار درویش' فسانہ آزاد' سیر کہسار' شریف زادہ' ابن الوقت' امراؤ جان ادا' پھر علامہ راشد الخیری' ایم اسلم' حجاب امتیاز علی' اور تو اور ابن صفی' صادق صدیقی سردھنوی کی ہر تصنیف۔ روسی مصنفین کے اردو ترجمے اور ترجموں پر یاد آئے منشی تیرتھ رام فیروز پوری... کتنی کتابیں خریدتے تھے ابا۔ ادب' تاریخ' فلسفہ' حکمت' سارا کچھ اردو میں۔ ابا ملازمت کے سلسلے میں کافی دن پنجاب رہ چکے تھے۔ وہاں ان کے ایک بزرگ دوست تھے منگت رام غیر جو اردو کے عاشق تھے۔ سینکڑوں کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک بار ابا سے بولے'' خاندان میں میرے بعد ان کتابوں کا کوئی قدر دان نہ ہوگا۔ صدیقی' تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو، تم انہیں لے جاؤ۔ میرا کیا۔ کب ٹپک جاؤں۔ سوچ کے افسوس ہوتا ہے۔ دیمک لگے گی یا رڈی میں بکیں گی۔''

''آپ سمجھتے ہیں میرے بعد میرے یہاں قدر دانی ہوگی؟''

''امید تو ہے۔''

''امید فضول ہے آپ کی۔''

ابا ان سے کچھ چنندہ کتابیں لے آئے تھے بمشکل ایک فیصد۔ پھر بھی ایک بڑا ٹرنک تھیں۔

کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے کی عادت ٹھہری۔ معظم نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ اب مکان سکڑ رہے ہیں۔ پہلی جیسی جگہیں کہاں۔ تاہم معظم کی نسل کی اولادیں برملا گستاخی سے پرہیز رکھتی تھیں۔ اس نے ناک بھوں تو چڑھائی لیکن بولا کچھ نہیں۔

ابا کی کتابوں میں اپنی کتابوں کا اضافہ کر کے وراثت کو سنبھالا تھا ریشم پھوپی نے۔ طب یونانی، فلسفہ، ویدوں اور گیتا کے اردو و فارسی ترجمے۔ ابا ایسی دقیق تصنیفات پڑھتے رہتے تھے۔

''آپا کیا پڑھتی رہتی ہیں۔'' معظم اپنی زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

''پھپوا گر دیمک چٹی کتابوں والی الماری خالی کر دیں تو اس میں شیشے لگوا کر ڈرائنگ روم میں رکھا جائے۔ ممی نے اتنے سارے ڈیکوریشن پیسز اکٹھا کر رکھے ہیں۔'' معظم کے بیٹے نے کئی بار تجویز پیش کی تھی۔

کتابیں بیشک دیمک چٹی تھیں اور بڑی ہی غیر دلکش جلدوں والی لیکن دادا کی چھوڑی ہوئی الماری تو آبنوس کی لکڑی کی تھی۔ پرانے طرز کی نقاشی والے بھاری فرنیچر کا بیحد دلکش نمونہ۔ وہ تو بذاتِ خود ایک آرائش تھی۔

''اب کی آموں فصل بک کر میرے حصے کے روپے آئیں تو میں ان سب کتابوں پر خوبصورت چمڑے کی جلدیں چڑھوا دوں گی اور الماری کے درمیانی حصے میں شیشے لگوا دوں گی۔ پھر تم اسے ڈرائنگ روم میں رکھ لینا۔'' پھوپی نے پیش کش کی۔

''پھپو کی جو بات ہے وہ نرالی۔'' اعظم نے منہ پھلا لیا۔ ''بھلا ان کتابوں پر مزید پیسہ پھینکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے کہتے ہیں گوبر میں گھی سکھانا۔''

پھپو کو اس گوبر میں گھی سکھانے والے محاورے سے قلبی اذیت پہنچی۔ اس بیش قیمت اثاثے کو یہ آج کے نوجوان گوبر سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے گلے میں پھنستے گولے کو نگلا۔

'ایں چہ شوریست کہ در دور قمری می بینم'

اسی میں تو آگے حافظ نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکیاں ماں کی بات نہیں مانتیں اور لڑکے بزرگوں

کے ساتھ بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ پرانی اور نئی نسلوں کا ٹکراؤ تو صدیوں سے چلا آرہا ہے مگر پھوپی اور ان کی ماں کے بیچ جو ٹکراؤ تھا وہ بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا اس لئے کہ اس وقت کی اقدار سوچ پر پہرے خواہ نہ بٹھا سکیں لیکن دریدہ دہنی کی اجازت نہیں دیتی تھیں اور یہ بھی تھا کہ اماں بالکل جاہل تھیں۔ پھوپی سوچتی تھیں وہ پڑھی لکھی ہیں۔ وہ جب ماں بنیں گی یا بزرگ تو ان کے اور اگلی نسل کے درمیان خیالات وافکار کا یہ بعد نہیں رہے گا۔

لیکن خیالات وافکار کا بعد کیا محض تعلیم کے ہونے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے یا زمانہ اسے خود بخود پیدا کرتا ہے؟ رہی زبان تو اس میں نئے الفاظ آجائیں۔ طرز میں تبدیلی آئے۔ لیکن زبان کہیں مرا کرتی ہے؟ پھپو نے شروع سے ہی معظم کی دلہن تاجور کو تاکید کی تھی کہ بچوں کو اردو پڑھوائیں۔ وہ ہر بار کنی کاٹ گئیں ''آپا ریشم' اب آج کل لڑکیوں کو اتنی فرصت کہاں ہے۔ ذرا کورس دیکھئے۔ اب سی بی ایس ای کے دسویں کے کورس میں اتنا سائنس پڑھا رہے ہیں جتنا ہم نے انٹرمیڈیٹ میں بھی نہیں پڑھا تھا پھر یہ کہ تینوں بچے پروفیشنل کورسز کے امتحانوں کی تیاری میں لگے ہیں۔ دس سے بارہ گھنٹے کی محنت۔ کوچنگ انسٹی ٹیوٹ۔''

تاجور نے پورا لکچر ہی دے ڈالا تھا۔

ریشم پھوپی نے یہ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی اور جس زبان کو بولنا آتا ہے اسے لکھنا اور پڑھنا سیکھنے کے لئے کوئی محض آدھا گھنٹہ روز صرف کر دے ...گھڑی دیکھ کر صرف آدھ گھنٹہ تو اتنا ہی کافی ہوگا۔ آخر یہ تینوں جب کورس کی پڑھائی ختم کر لیتے ہیں تو کوئی انگریزی ناول لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ناول اردو کا بھی ہوسکتا ہے۔

تاجور دل ہی دل میں کتنا بھی جھنجھلائیں لیکن شوہر کی ماں جیسی بزرگ' بڑی بہن سے کبھی بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی۔ پھوپھی کو اس کا خیال تھا۔

بدتمیزی تو اپنی بیٹی مرینہ ہی کر لیا کرتی تھی۔ وہ تقریباً معظم کی عمر کی تھی۔ ریشم پھوپی بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ مرینہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ماموں' بھانجی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے پھر اماں کا جلد ہی انتقال ہوگیا تو ریشم پھوپی نے معظم کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا

تھا پھوپی کے شوہر اچھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ ان کے بعد فیملی پنشن ملتی رہی۔ آبائی جائداد میں بھی پھوپی کا حصہ تھا اس لئے جب معظم کا اپنا کنبہ ہوا بچے ہو گئے تب بھی پھوپی کے ساتھ رہنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں تھیں۔ نہ ہی مرینہ کی شادی میں کوئی مالی دقت پیش آئی۔ مگر جس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر انہوں نے جوانی کاٹ دی تھی وہ بچی شادی ہونے کے کچھ ہی سال بعد امریکہ روانہ ہو گئی اور اس میں اس کے شوہر سے زیادہ اس کی اپنی خواہش کا دخل تھا اور وہاں کی چکا چوندھ کا، ایک ڈاکٹر کے بے پناہ پیسہ کمانے کے امکانات کا۔ تب سے وہ بے حد دلگرفتہ اور اداس رہا کرتی تھیں۔

دل بہلانے کے لئے انہوں نے محلے کی کچھ بچیوں کو مفت اردو پڑھانی شروع کی تھی۔ وہ کچھ دن آتیں پھر غائب ہو جاتیں۔ ''ابتدائی ہندی، انگریزی، میتھس وغیرہ پڑھا دیا کیجئے تو آئیں بھی۔'' معظم کی تجویز تھی۔

''ان مضمونوں کے لئے لوگ پیسہ خرچ کر لیں گے اردو مفت پڑھاتی ہوں اس لئے دو چار آ بھی جاتی ہیں۔ ان کی دلیل تھی، اردو کے لئے ٹیوشن نہ رکھے گا کوئی۔''

مرینہ نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ امریکہ آ جائیں۔ ایک بار گئی تھیں۔ ایسا خفقان ہوا کہ ویزا کی مدت پوری ہونے سے پہلے بھاگ آئیں پھر انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ مرینہ کے اصرار میں شدت اس وقت آئی تھی جب اس کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ پھر اس کی ایک سسرالی عزیز خاتون نے جو عمر دراز کنواری اور بھائیوں پر بھاری تھیں، امریکہ جانا منظور کر لیا اور اس کے ایک کے بعد ایک ہونے والے تینوں بچوں کو سنبھال دیا تب مرینہ نے ان کو امریکہ بلانے کی ضد چھوڑ دی۔ دو تین سال میں ایک بار خود ہی پندرہ دن کو آ جاتی تھی۔ ہفتہ بھر سسرال رہتی اور ہفتہ بھر ماں کے پاس۔

''اتنا ہی بہت ہے۔'' ریشم پھوپی ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔ وہ چلی جاتی تو اس کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ایک ایک دن گنا کرتی تھیں۔ کبھی دو سال کے تیرہ سو تیس دن اور کبھی تین سال کے ایک ہزار پنچانوے جمع تھوڑے سے اور۔ تب مرینہ اور اسکے بچوں کی صورتیں دکھائی دیتیں۔

''مرینہ، انہیں اردو سے نابلد مت رکھنا۔ اردو ضرور پڑھانا۔'' انہوں نے ہر مرتبہ کہا تھا۔

''بڑھاپے میں کیا سبھی لوگ سٹھیا جاتے ہیں؟ میں بھی سٹھیاؤں گی کیا؟ مجھے تو سوچ کر

گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' مرینہ نے جواب دیا تھا۔'' آخر کتنی بار کہیں گی ایک ہی بات'' اس مرتبہ جو مرینہ واپس گئی تو ریشم پھوپی کو پہلا دل کا دورہ پڑا تھا اور اس دن بھی وہ کتابوں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی کسی نایاب کتاب کے نسخے کو تلاش کر رہی تھیں جو بمزار وقت ابا میاں نے کہیں سے حاصل کیا تھا۔ معظم کی بیوی تاجور حسب معمول مونہہ ہی مونہہ میں بڑبڑاتی گھوم رہی تھی۔'' اب آج پھر انہوں نے یہ کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ شام کو معظم کے کچھ دوست مع بیویوں کے آنے والے ہیں صفائی میں دیر ہو جائے گی اور کیا تعجب جو آدھی کتابیں وہ یونہی باہر پڑی چھوڑ دیں کہ کل اٹھائی جائیں گی، کوئی چھونا مت۔''

اس دن آدھی کیا ساری کتابیں باہر نکلی رہ گئیں۔ پھوپھی اچانک سینہ پکڑ کر ان پر دوہری ہو گئی تھیں۔ تیسرے دن نرسنگ ہوم میں جب ان کی طبیعت بحال ہوئی تو پہلا سوال اپنی کتابوں کے بارے میں کیا۔'' انہیں کسی نے چھیڑا تو نہیں وہ ممدو کمبخت تو نہیں آن نکلا نظر لگانے۔'' ممدو اکثر انہیں چھیڑتا تھا۔'' باجی' آپ کی ردی کے لئے تو ٹرک اور دو چار آدمی لے کر آؤں گا۔ کب آ جاؤں؟''

کیوں چھونے لگا تھا کوئی وہ پرانی دھرانی کتابیں' وہ بھی اردو کی۔ انگریزی کی ہوتیں تو لڑکے لڑکیاں لے لے کے بھاگتے۔ ہندی ہوتیں تو تاجور نے الٹ پلٹ کی ہوتیں۔ تاجور نے بمشکل جھنجھلاہٹ ضبط کی۔ اب ریشم پھوپی پر ترس تو سب کو آتا تھا۔ لاکھ بھائی ماں سمجھے' اس کی اولادیں پیار سے پیش آئیں' اپنی اکلوتی بیٹی سے سات سمندر پار کی دوری۔ وہ بھی کسی مجبوری کے تحت نہیں' محض اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے۔ دل ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، اب احتجاج بھی کر بیٹھا۔ واپس آئیں تو ان کی آرام کرسی پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف ڈال دی گئی۔ سامنے میز پر کتابیں رکھ دی گئیں اور کاغذ قلم......

کاغذ قلم کس لئے؟ اب کوئی خط و کتابت نہیں کرتا۔ لوگ فون کرتے ہیں یا ای میل۔ الفاظ اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ ای میل کی زبان بھی کیسی ہو گئی ہے۔ کاغذ قلم لے کر پھوپھو نے اپنا روزنامچہ درج کرنا شروع کیا۔ چلو خط نہ سہی کچھ تو لکھیں۔ پہلے دن ہی لکھا۔'' زندگی کے کتنے دن اور باقی ہیں؟ کتنے صفحات پُر ہوں گے؟'' ساٹھ صفحات پُر ہو سکے۔

دو مہینے بعد پھوپی کو دوسرا دورہ پڑا جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوا۔

مرینہ کو فون کیا گیا تھا لیکن اسکی فلائٹ سات گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ پھوپی وہ سات گھنٹے نہیں جھیل سکیں۔ ان کا پورا وجود تنے ہوئے اعصاب کا گچھا بن چکا تھا۔ ان کی آنکھیں دروازے پر تھیں اور لب مرینہ کا ورد کر رہے تھے۔

مرینہ پہنچی تو وہ ابدی نیند سو چکی تھیں۔

''کتنی بار امی سے کہا کہ میرے ساتھ چل کر رہیں' نہیں مانیں۔ نواسے نواسیوں کا سکھ بھی دیکھ لیتیں۔'' مرینہ نے دل گرفتہ آواز میں دوسری بار کہا تو تاجور برا مان گئیں۔

''یہاں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی مرینہ۔ علاج میں بھی ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔'' تاجور نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ممانی۔ میری صورت نہیں دیکھ سکیں۔ ناشاد گئیں اس کا ملال ہے۔''

تاجور شرمندہ سی ہو گئیں۔

چالیسویں کے بعد مرینہ نے واپس جانے کی تیاریاں شروع کیں تو تاجور نے واضح الفاظ میں کہا'' مرینہ اپنی امی کا سامان دیکھ لو۔ اب نہ جانے کب آؤ گی۔ آگے چل کر کوئی تلخی نہ ہو۔''

''آپ جیسا چاہیں'' مرینہ نے مختصر جواب دیا۔

ریشماں سلطان المعروف بہ ریشم پھوپی نے باقاعدہ وصیت تیار کر رکھی تھی۔ لفافہ ان کے ٹرنک سے نکلا۔ دو چار بچی زری کی بھاری ساریاں اب بھی موجود تھیں ان کے حصے کا آموں کا باغ تھا وہ مرینہ کے بچوں کا تھا۔ معظم کے بیٹے کے لئے انہوں نے اپنی پوری نقد رقم چھوڑ دی تھی جو اچھی خاصی تھی باقی چیزوں کے لئے بھی واضح ہدایات موجود تھیں مثلاً ہاتھی دانت کا بیش قیمت فوٹو فریم' جیڈ کا گلدان وغیرہ وغیرہ۔ کتابوں کے لئے انہوں نے لکھا تھا۔'' جو ان کی قدر کر سکے وہ انہیں رکھ لے۔''

''لے جانا چاہو تو کچھ کتابیں دیکھ لو۔'' تاجور نے یہ رسمی طور پر کہا تھا کہ کتابیں آخر مرینہ کی ماں کی ملکیت تھیں۔ جواب تو انہیں معلوم ہی تھا۔

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔'' کیا بات کرتی ہیں ممانی! میں کیا کروں گی ان کا؟ اور کیا انہیں لے جانا ممکن ہے؟''

''مرینہ، تمہارے ماموں یہ پرانا مکان بیچ کر کسی اچھے علاقے میں فلیٹ لینے کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل پہلے ابو اور پھر ان کے بعد ریشم آپا کے جذبات کا خیال کر کے ہی خاموش تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو فلیٹ میں اتنی گنجائش کہاں۔ تمہاری امی کے کئی ٹرنک کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بڑی سی آبنوس کی الماری ہے، دو اسٹیل کی چھوٹی الماریاں ہیں۔'' وہ بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئیں۔

''اس سلسلے میں آپ جو چاہیں کریں۔ میں کبھی کوئی جواب نہیں طلب کروں گی۔'' مرینہ نے اداسی سے کہا اور اگلے ہفتے واپس چلی گئی۔

معظم نے کوئی دس بیس کتابیں جو نایاب تھیں اور جن پر پھوپی نے خوبصورت جلدیں بندھوا دی تھیں، شیشے کی الماری میں آرائشی سامان کے ساتھ رکھنے کے لئے الگ کر لیں۔ ویسے ان سے ابا کی یادیں بھی وابستہ تھیں۔ ریشم دو انگریزی رسالے بھی لیا کرتی تھیں، نیشنل جیوگرافک' اور ریڈرز ڈائجسٹ' ان کے پانچ سات شمارے تاجور نے رکھ لئے۔ باقی کے لئے انہوں نے ممدو کو بلا بھیجا۔

آنکھیں پونچھتا ممدو ٹرک تو نہیں ہاں بڑا والا ٹھیلہ ضرور لایا تھا۔ ساتھ میں اس کا بیٹا بھی تھا۔ دونوں باپ بیٹا لنگی چڑھائے صبح سے دوپہر تک ردی چھانٹ کر الگ کرتے رہے۔ مجلد کتابوں کی جلد علاحدہ کر کے تولا گیا۔ ان کتابوں اور پرانے رسالوں کے دام سوا روپے فی کلو لگائے گئے۔ تاجور کے احتجاج پر ممدو نے کہا۔ ''پانچ روپے کلو اخبار بکتے ہیں دلہن بی بی وہ بھی نئے اس لئے کہ ان سے لفافے بن جاتے ہیں۔ ان کتابوں کا کیا مصرف ہے ہاتھ لگاؤ تو کاغذ جھڑیں۔''

تاجور جھینپ مٹانے کو پوچھنے لگیں۔ ''اور ان کا کیا ہوگا؟ آخر خرید کر تو تم لے ہی جا رہے ہو؟''

''لو اب ہم آپ کو بتائیں گے۔ ان سب کی لگدی بنا کر سنتے ہیں دوبارہ کاغذ ہی بنتا ہے۔''

قبر میں ریشم پھوپی نے کروٹ بدلی

ہاں انہیں 'ری سائیکل' کیا جائے گا ان پر لکھے سارے حروف مٹ جائیں گے' لگدی بن کر ان کا کاغذ بنے گا۔ کورا کاغذ۔ لیکن کیا کوئی تھوڑا سا کاغذ اردو لکھنے کے لئے بھی مانگے گا؟ کوئی میر' کوئی غالب' کوئی فیض' کوئی عصمت' کوئی قرۃ العین؟

ان کی بے چین روح چکراتی پھر رہی تھی۔

☆☆

سارے جہاں سے اچھا

بس سے اتر کر خاصی دور تک پیدل چلنا تھا۔ سنیتا نے بڑی کوفت کے ساتھ اپنی کلف لگی ہوئی کراری سوتی ساڑی کا حشر دیکھا۔ ابھی تو خیر کچھ ہی شکنیں پڑی تھیں۔ واپسی تک پوری لگڑی بن جائے گی۔ کسی برتن مانجنے والی مائی کی لگری۔ اصولاً کوئی سنتھیٹک ساری پہننی چاہئے تھی لیکن گرمی بہت تھی۔ ویسے ہی لوگ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔

''سالی جی! آگے کیا وچار ہے' چلا جائے؟'' سنیتا کے بہنوئی وبھوتی شرن زیر مونچھ مسکرائے۔

''چلنا تو ہے ہی۔'' وہ جھلا کر بولی۔ ''یہاں تک کیا جھک مارنے آئے تھے؟''

''تو چلئے آگے کے باقی بچے پاپڑ بھی بیل لیں۔''

سنیتا نے ان کی طرف مصنوعی غصے سے گھورا اور ساری کی شکنیں برابر کیں۔

''ذرا پہلے کسی سے پوچھ تو لیجئے کس طرف کو جانا ہے۔''

''جہاں جانا تھا وہاں پہنچے نہیں ہیں کیا؟'' وبھوتی کے لہجے میں شرارت تھی۔

''ارے تو آگے بھی جانا ہے نہ کہ یہیں جھنڈا گاڑنا ہے''۔ سنیتا اور زیادہ جھنجھلائی۔

''بالشت بھر کا گاؤں۔ آگے جانا ہے' آگے جانا ہے۔ لندن جانا ہے۔ ارے چلی چلئے ناک کی سیدھ۔'' وبھوتی شرن ڈپٹ کر بولے۔

سنیتا روہانسی ہوگئی۔ گاؤں کی صورت دیکھ کر پہلے ہی روح فنا ہو رہی تھی۔ دور دور تک بھورا

چٹیل میدان یا ارہر کے کھیت ۔ پھر یہ کہ آس پاس نہ آدمی نہ آدم زاد ۔بس مسافروں کو اتار کر آگے بڑھ گئی تو گاؤں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔اور مسافر بھی کون بہت سے تھے۔دو تو یہ سالی بہنوئی اور ایک کوئی چھوٹا موٹا دکاندار جو قصبے سے سامان خرید کر لایا تھا۔اسے خود ہی سر پر لادا اور اچھا خاصہ وزن لے کر یوں سرسر بھاگا جیسے اس کے پیروں میں پہیے لگے ہوئے ہوں۔ دیکھنے میں بالکل ہونق لگ رہا تھا۔

''اور پورا کیجئے پڑھانے کا شوق۔'' وبھوتی شرن کو سادہ سے جملوں کو اس طرح ادا کرنے میں ملکہ حاصل تھا کہ سن کر چھن سے بگھار لگے۔

یہاں آکر پڑھانے کا شوق کس کو تھا بھلا۔خدا خدا کر کے نوکری لگی تو پوسٹنگ یہاں ہوگئی اللہ میاں کے پچھواڑے۔

پہلے سنیتا نے گریجویشن کیا۔ارادے ذرا اونچے تھے۔کئی امتحانوں میں بیٹھی ۔یو پی ایس سی تو بساط سے باہر معلوم ہوا اس لئے صوبائی ایڈمنسٹریٹیو سروس کے لئے کوشش کی۔پھر بینک میں پی او کے لئے امتحان دیا۔کامیابی ہاتھ نہ آئی تو اس نے بی ایڈ کر ڈالا اور ایجوکیشن سروس کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھی ۔نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

''اب ٹیچری ہم نہ کریں گے۔پڑھانا ہی ہے تو کم از کم لکچرر تو بنیں۔'' مقابلے کے امتحانات کے دوران ہی اس نے ایم اے کا فارم بھر دیا تھا۔

''میم صاحب۔آج کل خالی خولی ایم اے سے کچھ نہیں ہوتا۔یہ سب تو پچھلے وقتوں کی باتیں ہیں۔اب تو پی ایچ ڈی کیے ہوئے لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں وہ بھی بھر بھر جھولی پیسوں کے ساتھ۔''

''بڑا جھمیلا ہے بھبھوتی بھائی صاحب یہ ساری زندگی کا پڑھنا۔اب پی ایچ ڈی کون کرے۔'' سنیتا وبھوتی شرن کو ہمیشہ بھبھوتی بھائی صاحب کہا کرتی تھی۔

''بٹیا۔کوئی جھمیلا نہیں ہے باپ سے کہو پچیس۔تیس ہزار کا انتظام کر دیں۔تھیسس لکھوانا ہمارا کام ہے۔کئی پروفیسر حضرات آج کل یہی کام کر رہے ہیں۔نہ جانے کتنے جاہلوں کو ڈاکٹریٹ دلوا دی۔''

''ہم اب بابو جی سے کچھ نہیں کہیں گے۔اتنا پڑھا لکھا دیا۔شادی کی فکر میں الگ گھلے جا

رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی خریدنے کو کس منہ سے ان سے پیسے مانگیں۔ اب کرنی ہی پڑی تو خود ہی کریں گے۔''

''تو کرو مجوری۔ کھٹو تین چار برس اور۔''

''نا بابا نا۔ اتنی مجوری ہم سے نہ ہوگی۔ سوچ رہے ہیں ایم۔ ایڈ کر ڈالیں۔ ٹریننگ کالج میں ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ وہاں کے لئے ایم ایڈ ضروری ہے اور ایم۔ ایڈ کم لوگ کرتے ہیں۔ بی۔ ایڈ تو ہم کر ہی چکے ہیں اس لئے سال بھر کی بات ہے۔''

''یہ سال بھر بھی کیوں لگاؤ۔ چلو بابو جی کی طرح ہم بھی ستو باندھ کر تمہارے لئے دولہا ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ سال بھر سے پہلے مل جائے گا۔ گارنٹی ہے۔'' وبھوتی شرن نے آنکھ ماری۔

''بہت لوگ نکلے ہوئے ہیں۔'' سنیتا نے جلبلا کر کہا۔ ''آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔''

''بڑی مصیبت ہے۔ لڑکی لمبی ہے اوپر سے رنگ کم ہے۔ طرہ یہ کہ پڑھی لکھی زیادہ ہے۔ مزید طرہ یہ کہ ایک ڈگری اور لینے کی بھی بات کر رہی ہے پھر سونے پر سہاگہ بھائی ڈاکٹر' باپ وکیل۔ ایسی عربی گھوڑی کے لئے کہاں سے لائیں گھوڑا۔ ایرا غیرا تو چلنے سے رہا تمہاری دیدی کی طرح سب خوش قسمت تھوڑی ہیں کہ ہم جیسے مل جائیں۔''

''کیا کہنے ہیں آپ کے اور دیدی کی خوش قسمتی کے۔'' سنیتا نے دل ہی دل میں دانت کٹکٹائے۔ رنگ تو دیدی کا بھی کم ہے۔ بابو جی نے بھاری تلک دیا اوپر سے گھر جمائی بنایا۔ حضرت کے گھر میں کیا رکھا تھا۔ یہاں دیدی کو اٹیچڈ باتھ روم کے ساتھ الگ کمرہ دیا گیا اس میں کولر' رنگین ٹی وی' وی سی آر' سب فٹ کرایا گیا۔ بڑا سا بیڈ' رائٹنگ ٹیبل۔ سامنے چھوٹی سی لابی۔ اس میں صوفہ تا کہ ان کے ملنے جلنے والوں کو پوری پرائیویسی مل سکے۔ ہم تو نہ کریں ایسے آدمی کے ساتھ شادی۔ بیاہ کر کے بھی اماں بابو جی کے سر پر سوار رہنا ہے تو کنوارے ہی بھلے۔ ویسے بھبھوتی بھائی صاحب ہیں خوش مزاج' دیدی کا خیال بھی کرتے ہیں۔ اب تو کمانے بھی لگے ہیں۔ کوچنگ سینٹر کھول لیا ہے۔ شادی کے وقت تو بے روزگار تھے۔

وبھوتی شرن بڑی دریدہ دہنی سے دونوں بہنوں کی سانولی رنگت پر تبصرہ کر جایا کرتے تھے۔ مگر سنیتا نے ان کے بارے میں جو سوچا وہ کہہ نہ سکی۔ وہ لاکھ خوش مزاج ہوں ایسی کڑوی باتیں سنائی جائیں تو آفت ہی آ جائے گی۔ سارا کچھ دیدی کو سہنا پڑ جائے گا۔ کون دیکھنا چاہتا ہے آئینہ؟

سنیتا نے آخر کار ایم ۔ ایڈ بھی کر ڈالا ۔ داخلے میں پریشانی ہو رہی تھی ۔ اس وقت یہی بہنوئی کام آئے ۔ کوچنگ سینٹر چلانے کی وجہ سے مختلف کالجوں کے کئی اساتذہ سے جان پہچان تھی ۔ امتحان ہوئے تو نمبر بڑھوا کر فرسٹ ڈویژن بھی دلوا دیا ۔ سنیتا نے اپنے اصولوں کی پابندی اس حد تک ضرور کی تھی کہ امتحان میں چوری نہیں کی تھی جبکہ اغل بغل کے بیشتر طلباء کتابیں اور کاغذ کی چٹیں لئے دھڑلے سے نقل اتار رہے تھے ۔ لیکن ایمانداری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کھینچ تان کر سکنڈ کلاس آتا ۔ بہرکیف ۔ فرسٹ کلاس کے باوجود لکچر شپ نہیں ملی ۔ وہاں اس سے بھی بہت زیادہ کچھ درکار تھا ۔ اماں کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا رہنے لگا تھا کہ نہ لڑکی کے لئے دولہا مل رہا ہے نہ ملازمت ۔ ملازمت مل جاتی تو شادی میں بھی آسانی ہو جاتی ۔ تنگ آ کر سنیتا نے ٹیچر کی ملازمت کے لئے درخواست دی ۔ کچھ جگہیں سرکاری اسکولوں میں نکلی تھیں ۔ انٹرویو ہوا تو سنیتا منتخب کر لی گئی یہ در اصل ایسا ہی تھا جیسے مچھر مارنے کو اینٹی ائر کرافٹ لگائی جائے ۔ بی اے آنرز' ایم اے' ایم ایڈ اور ابتدائی درجوں کے طلباء کو پڑھانے کی خواستگار ۔

''سرکاری ملازمت ہے ۔ پھر تنخواہیں بہت اچھی ہو گئی ہیں ۔ کام دھام ہے ہی نہیں ۔ سارے ٹیچر مکھیتی کر رہے ہیں ۔ مفت کے ساڑھے تین ہزار ہاتھ آئیں گے ۔ بلکہ ملا جلا کے چار ہزار ۔''
وبھوتی بابو نے خوش ہو کر کہا تھا جیسے انہیں کو مل رہے تھے یہ مفت کے ساڑھے تین چار ہزار ۔

''ہاں ۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ۔'' سنیتا نے اداس ہو کر اور موہنہ لٹکا لیا ۔

''آج کل اس مسلمان لونڈے کے ساتھ بہت اٹھنا بیٹھنا ہو رہا ہے ۔ بڑا غالب کوٹ کرتی رہتی ہو ۔'' وبھوتی شرن نے سنیتا کو ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے گھورا ۔

''ساہتیہ کار کو سیماؤں میں نہیں باندھا جاتا ۔ غالب مسلمانوں کی پوتی ہیں کیا؟'' سنیتا چڑ گئی

''اجی اب تو مسلمانوں کی پوتی بھی نہیں رہے ۔ غالب پڑھ کے کون سی روٹی ملنی ہے ۔ اب وہ لائبریریوں میں نظر آتے ہیں یا اردو کے کلاسوں میں جہاں دو چار سکڑے ہوئے دماغوں والے بچے بیٹھے اسی طرح کے ٹیچروں سے پڑھ رہے ہوتے ہیں ۔''

''بھبھوتی بھائی ۔ انسان خواہ کتنی بھی مادی ترقی کر لے اور مادہ پرست ہو جائے ادب اور فن سے جان چھڑا کر بھاگ نہیں سکتا ۔ آخر روٹی کپڑا مکان کے آگے بھی کچھ چاہئے ۔ دل کا سکون' کچھ خوشی...''

''دل ول کی باتیں زیادہ کرتی رہی ہو اسی لئے نوکری کے لالے پڑ رہے ہیں مائی ڈیئر سس' سالی''

وبھوتی شرن کبھی کبھی ''سالی'' یوں ادا کرتے کہ رشتہ گالی جیسا لگنے لگے۔ پتہ نہیں کس ستم ظریف نے سب سے پہلے سالا اور سالی جیسے رشتوں کو بطور گالی استعمال کیا تھا۔ وہ اردو والا تھا یا ہندی والا۔ یہ گالی کس لغت میں لکھی جائے ایک دنگا اس پر بھی ہو جانا چاہئے۔ اب ذرا یہ دیکھئے کہ انگریزی جیسی بھرپور زبان لیکن کسی عورت کو کہئے سسٹر ان لا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ مگر سالی وہ بھی ذرا سُر تال کے ساتھ ادا ہو جائے تو سننے والے کو چھن سے لگتا ہے جیسے ابھی سنیتا کو لگا۔ لیکن نوکری والا معاملہ ایسا تھا کہ وہ چپ ہو جایا کرتی تھی۔ واقعی اگر آرٹس کی جگہ سائنس پڑھا ہوتا تو ابھی انہیں بھبھوتی بھائی صاحب کے کوچنگ سینٹر میں لگ جاتی۔ آخر انہیں نوکری نہیں مل سکی تھی تو اسی طرح اچھا خاصہ کمانے لگے تھے۔ مگر سنیتا ٹھہری ہسٹری کی طالبہ۔

''اٹھاؤ پھاوڑہ۔ کھودو مردے'' وبھوتی شرن سنیتا کو چڑاتے تو باقاعدہ پھاوڑہ اٹھا کر کھودنے کا پوز بھی بناتے۔ سنیتا سوچا کرتی تھی کہ ایم اے کرنے کے بعد وہ بی ایڈ کے طلباء کو پڑھائے گی کہ وہ ہسٹری کیسے پڑھائیں۔ یا نہ پڑھائیں۔ کلاس میں بیٹھ کے سوئیں مگر وہ انہیں ان زریں اصولوں سے آگاہ کرائے گی جو کتابوں کی زینت ہیں اور بعد میں زینت طاق نسیاں بنتے ہیں۔ بہرحال وہ لکچرر کہلائے گی جو عام طور سے خود کو پروفیسر کہلانا پسند کرتے ہیں کہ یہ لقب انہیں زائد مرتبے کا احساس کراتا ہے اور وہ ذرا ایڑیاں اٹھا کر چلنے لگتے ہیں۔ مگر سنیتا کی ایڑیاں اٹھا کر چلنے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ ہاتھ لگی محض اسکول کی ٹیچری اور پوسٹنگ ہوگئی گاؤں کے راجکیہ ودیالیہ میں۔ اس نے آفس جا کر کچھ معلومات حاصل کیں تو لوگوں نے بتایا کہ دس بیس ہزار خرچ کرنے کو راضی ہو تو پھر کچھ عرصے بعد جہاں چاہو تبادلہ ہو جائے گا۔ ہاں فی الحال جوائن کرنا تو ضروری ہے۔

جوائن کرنے اور پھر کچھ دن ڈیوٹی دینے کے لئے اکیلے جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس لئے پکڑے گئے وبھوتی شرن۔ اب گھر داماد بنے تھے تو گھر کی کچھ ذمہ داریاں تو اپنے سر لینی ہی تھیں۔ کہنے لگے ''چل سا۔لی لے چلیں تجھے ارہر کے کھیت میں۔''

''رہے نا ٹچے کے ٹچے۔ کیسا بھی پڑھا لکھا شریف مرد ہو۔ لیکن سارے مذاق بس اسی کے گرد گھومتے ہیں۔'' سنیتا نے دانت پیس کر کہا۔

''کس کے گرد؟'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

''مونچھیں اکھاڑ لیں گے۔'' سنیتا نے مصنوعی غصے سے آنکھیں دکھائیں۔

کئی ارہر کے کھیت پار کر لینے کے بعد بھی راجکیہ مادھمک ودیالیہ تو کہیں دکھائی نہیں دیا' ہاں ایک چھوٹا سا پوکھر ضرور ملا۔ اس کے کنارے ایک جوان ہٹی کٹی عورت بیٹھی جھائیں جھائیں برتن مانجھ رہی تھی۔ مٹی اس نے آس پاس کی زمین سے ہی اٹھائی تھی جہاں چند قدم پر بیٹھا اس کا (یا کسی اور کا) بچہ پاخانہ کر کے بس ابھی اٹھا تھا۔ دو چار کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے بھی ذرا سی دور پر کھیل رہے تھے۔ عورت نے ان لوگوں کی طرف قطعی کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ کئی بار اس طرح کی نوٹنکی کرنے والی میم صاحب لوگوں کو دیکھ چکی تھی اور ان سے سخت عاجز تھی۔ کبھی آ کے کہتیں بچے کم پیدا کرو' کبھی کہتیں بچوں کو ٹیکے دلواؤ۔ اس کے سات بچوں میں سے چار بچے زندہ تھے۔ اگر اس نے کم بچے پیدا کئے ہوتے تو یا تو ایک بھی نہ رہتا یا شاید ایک بچا ہوتا۔ بس ایک۔ رہے ٹیکے تو ایک بار وہ ان کی باتوں میں آ کے بلاک کے سواستھ کیندر گئی تھی معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب بھاگے ہوئے ہیں۔ کبھی رہتے ہی نہیں۔ کمپاؤنڈر تھا۔ جھڑک کر بولا'' دوا ہے ہی نہیں۔ ٹیکہ کا ہے سے لگائیں' گو موتر سے؟ چل بھاگ۔ پھر کبھی آئے گی۔'' دو چار عورتیں اور بھی تھیں۔ سب کی سب مونہہ لٹکائے واپس آ گئیں۔ پیچھے سے کمپاؤنڈر بڑبڑایا۔ سرکار بھی خوب ہے۔ ان سب کو ٹیکے لگیں گے۔ کون سا سالا یہاں نہرو گاندھی پیدا ہونا ہے۔ پھر یہ سب کے سب بھلے چنگے ہو گئے تو ہماری تو دال روٹی چل چکی۔ سواستھ کیندر کے کمپاؤنڈر صاحب باقاعدہ ''پریکٹس'' کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کر مفت دی جانے والی دوائیاں بیچا کرتے تھے۔

اب یہ آج پھر چلی آ رہی ہیں بھاشن دینے۔

سنیتا عورت کے قریب آ چکی تھی اور عورت کی بے نیازی اس میں جھنجھلاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

''یہاں آگے کوئی اسکول ہے؟'' سنیتا نے جھنجھلاہٹ کو حتی الامکان قابو میں کر کے لہجے میں نرمی لانے کی کوشش کر کے اس سے پوچھا۔ اب عورت نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''کون ہو تم؟'' لہجہ بڑا سپاٹ اور کھردرا تھا۔

''ہم کو وہاں جانا ہے۔ اسکول۔''

''ہاں جانا تو ہے پر تم ہو کون؟''

''ہم کو وہاں پڑھانا ہے۔''ٹیچر بحال ہوئے ہیں۔''

''مردانے اسکول میں مہرارو؟''

''وہاں لڑکیاں نہیں پڑھتیں کیا؟'' سنیتا کو ایک اور پریشانی لاحق ہوگئی

''نام تو لکھائے ہوئے ہیں۔'' اس نے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہا'' پر جاتا کون ہے۔ سب گھر میں چولہا چوکا کریں گی کہ جائیں گی پڑھنے۔ کونو کونو دن چلی جاتی ہیں۔''

''عورتیں پڑھاتی ہیں کہ نہیں؟''

''دوٹھو ہیں۔ کبھی آتی ہیں' کبھی نہیں'' پھر اس نے بھی وہی سوال کیا۔ تڑ سے۔ پتھر کی طرح سخت' چوٹ مارنے والا۔''بیاہ ہوئی گوا تہار؟''

سنیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے چل پڑی۔ بڑی کم بخت عورت ہے۔ اتنی بکواس کی مگر یہ نہ بتایا کہ اسکول کے لئے سنیتا کس طرف جائے۔ اس کے سوال سے سنیتا کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے مزید تفتیش بھی نہیں کی۔

وہ عورت جاتی ہوئی سنیتا کو غور سے گھورنے لگی۔ پھر اس نے اندازہ لگالیا کہ اس بھرپور جوان لڑکی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مانگ میں سندور نہیں' پیروں میں بچھوے نہیں' ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں نہیں۔ نہ جانے اس مردسے کیا رشتہ ہے جس کے ساتھ ڈاواں ڈاواں ڈولتی چل رہی ہے۔ ہونہہ۔ اس نے وہیں برتنوں کے پاس تھوکا۔..''بیاہ ہوا نہ گونا۔ چلیں جھولا لٹکا کے مہاٹرائی (ماسٹری) کرنے۔'' آواز بہت کرخت اور اونچی تھی۔ اور تھکی ہوئی سنیتا کی رفتار بہت تیز نہیں تھی اس لئے سنیتا نے بھی سنا اور وبھوتی شرن نے بھی۔

''کیوں' کہہ دوں کیا کہ اتنا ناراض نہ ہو۔ تمہاری شادی ہوچکی ہے اور میں تمہارا' وہ' ہوں۔'' وبھوتی نے اپنی فطری کمینگی کے ساتھ کہا۔

سنیتا خاصی زچ ہوچکی تھی۔ جب وہ یہاں آرہی تھی تو بس میں اس کی بغل میں ایک ادھیڑ عمر دیہاتی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وبھوتی شرن کی طرف مونہہ گھما کر اس نے بھی کہا تھا'' مالک ہتھن؟'' (شوہر ہیں؟) سنیتا کے خاموش رہنے پر اس نے سوال دوہرایا تو اسے جواب دینا پڑا

''ہماری شادی نہیں ہوئی۔ یہ جیجا ہیں۔''

عورت شاید یہ نہیں سوچ سکی تھی کہ اتنی بڑی عمر کی لڑکی غیر شادی شدہ بھی ہوسکتی ہے۔ مانگ

میں سندور کی غیر موجودگی پر اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ لیکن اب اس نے ایک ترچھی نظر اس کے سر پر ڈالی۔ پھر اپنی زبان میں کہا'' ہماری لڑکی تم سے عمر میں چھوٹی ہوگی مگر اس کی تو بیٹی بھی اب آٹھ نو سال کی ہوگئی۔''

''تو ہم کیا کریں۔'' سنیتا نے سپاٹ لہجے میں سادہ سا جواب دیا

''آج کل شہر میں عجیب چلن ہو گیا ہے۔'' عورت پھر گویا ہوئی۔''لڑکیاں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہیں۔ میم صاحب بننے کا شوق چرا رہا ہے۔ بنو' ضرور بنو۔ مگر کان کھول کر سن لو۔ بغیر مرد کی بانہہ پکڑے گذارا ہونے والا نہیں ہے۔''

سنیتا نے اب جواب دینا فضول سمجھا اور کھڑکی کی طرف مونہہ کر کے بیٹھ گئی۔

کمال ہے' اماں' بابو جی اور دیدی کو تو اس کی شادی کی فکر تھی ہی۔ تھوڑا بہت بڑے بہنوئی ہونے کے ناطے وبھوتی شرن بھی زور دینے لگے تھے لیکن اب تو ساری دنیا پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتی محسوس ہو رہی ہے۔

سنیتا نے پلٹ کر اس عورت کی طرف عقابی نظروں سے دیکھا جواب سر جھکا کر دوبارہ برتن مانجھنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

کوئی سو گز آگے بڑھنے پر ایک شکستہ سی عمارت دکھائی دی جس پر اسکول کا شبہ ہو سکتا تھا۔ چار چوکور کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ چھت کھپریل کی مگر دیواریں پختہ۔ آگے میدان تھا۔ بھورا' خشک' دھول اڑاتا میدان۔ چند بے ہنگم بچے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دور پر بھینسیں چر رہی تھیں۔ دو چار بکریاں بھی آس پاس کو در ہی تھیں۔ قریب آنے پر ایک خستہ حال بورڈ دکھائی دیا جو آدھا لٹک چکا تھا۔ اچانک نہ جانے کہاں سے کچھ کالے کلوٹے' میلے کچیلے بچے غول بیابانی کی طرح نمودار ہو گئے اور ہونقوں کی طرح سنیتا کو دیکھنے لگے۔ دو تین ذرا زیادہ ہی قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے اس کی ساری کا پلو چھوا۔

''ارے ہٹ۔'' دوسرے نے اسے ڈانٹا'' دیکھتا نہیں' نیا بہن جی آیا ہے۔''

ایک ماسٹر صاحب کلاس میں تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے کلاس چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ آنے کا مقصد پوچھا۔ معلوم ہوا تو بولے'' چلئے سر کے پاس۔''

''سر'' یعنی ہیڈ ماسٹر صاحب کا آفس ان کمروں کی پشت پر برگد کے نیچے تھا۔ بچے' سنیتا'

وبھوتی شرن اور ماسٹر صاحب کے پیچھے پیچھے چلے۔

''اے لڑکا سب۔ بھاگ یہاں سے۔ بھگتا ہے کہ نہیں۔'' ماسٹر صاحب غرائے۔'' پڑھتا کیوں نہیں ہے؟ جا' جا کے پڑھ۔''

''مہاٹر جی نہیں آئے۔'' لڑکوں نے کورس میں جواب دیا۔

''تو اپنے سے پڑھ۔ جا' جا کے بیٹھ کلاس میں۔''

''کلاس کھالی نہیں ہے سر۔ سب میں پڑھائی ہو رہا ہے۔'' ایک اور کورس بلند ہوا۔ سنیتا کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یہاں پڑھانا پڑیگا۔ نہ جانے کب ٹرانسفر کرا سکے گی۔ وبھوتی بھائی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ جوائن کر لو پھر میڈیکل سٹرٹیفکیٹ دے دینا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ لیکن آفس میں لوگ کہہ رہے تھے کہ فورا میڈیکل لیو ملنا اتنا آسان نہیں رہ گیا ہے۔ نئے نئے قانون بن گئے ہیں۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ماسٹر جی کی پھٹکار کے باوجود لڑکے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ بلکہ دو چار اور آن ملے۔

بچپن میں سنیتا اپنی نانیہال جایا کرتی تھی وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں اکثر بہروپیا آیا کرتا تھا۔ کبھی ہنومان بنتا' کبھی مسلمان فقیر' کبھی گھنگرو باندھ کر چھم چھم ناچتا۔ جیسے ہی وہ نمودار ہوتا' محلے کے لونڈے اس کے پیچھے تالی بجاتے چلنے لگتے۔ سنیتا کو محسوس ہوا بس تالی بجنے کی دیر ہے۔ اس نے پلٹ کر ایک خشمگیں نگاہ ان ڈھیٹ' دیہاتی بچوں پر ڈالی۔ حماقت ان کے چہروں پر بخط جلی لکھی ہوئی تھی۔ سنیتا کے یوں دیکھنے پر وہ ہی ہی ہی کر کے ہنسنے لگے۔ ایک لڑکے نے کہا ''دیدی بال کٹائے ہیں۔'' دوسرے نے اس کی تائید میں سر ہلا کے کہا ''بل کٹی'' سنیتا پسینے پسینے ہوگئی۔ وبھوتی شرن کی مونچھوں کے نیچے بڑی گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

برگد کے پیڑ کے نیچے ہیڈ ماسٹر صاحب کھٹیا پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے ان سے چند قدم پیچھے رک گئے۔ سنیتا قریب آئی۔

''آیئے آیئے۔ ہمیں معلوم تھا آپ 'جوائننگ' دے رہی ہیں۔''

اسسٹنٹ ماسٹر صاحب پاس پڑی اٹنگی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئے تھے۔ ذرا ادب کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پلنگ کی پائنتی سے ٹک گئے۔ اٹنگی کرسی پر انہوں نے سنیتا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یکا یک بغل کے کمرے سے زور زور سے پہاڑے یاد کرنے کی آوازیں سماعت پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔ ''دوکادو..دو دونی چار..دو تیائی چھ....'' مارچ کی ڈھول بھری، گرم ہوتی ہوئی ہوا چکر کاٹتی' ان بے سری آوازں کو دوش پر لئے چاروں طرف پھیل گئی۔ برگد کے بہت سے پتے سنیتا کے اوپر گرے۔ پھر ہوا کے ساتھ تتر بتر ہونے لگے۔ جیسے وہ سارے نظریات جو اس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔ وہ روسو اور والیٹر اور فروبیل اور ماریہ مونٹیسری۔ روسو نے اٹھارہویں صدی میں یوروپ میں تعلیمی اصولوں' نظریوں' اور طریقوں کی کایا پلٹ کردی تھی۔ انسانی فلاح اور انسانی مسرتوں پر ایک ایک فرد کا حق ہے۔ یہ کسی کی جاگیر نہیں ہیں اس نے کہا تھا۔ فروبیل نے اسکول کو بچوں کے باغ کا نام دیا تھا۔ کنڈرگارٹن۔ یعنی اسکول باغ کی صورت خوشنما اور خوشیاں بکھیرنے والا مقام ہو۔ اور مادام مونٹیسری نے رنگوں اور حسن فطرت کے ذریعہ ننھے بچوں کے حواس خمسہ کی تربیت کی بات کی تھی۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ ان کے یہاں لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ حسن اور رنگینوں کی بات کرسکتے تھے کہ حسن اور رنگینیاں جب ہی سوجھتی ہیں جب پیٹ میں روٹی پوری ہوتی ہے۔ جو بھی ہو' ہم اپنی ساری کٹھ حجتی کے بعد بھی اٹھارہویں صدی تک کو نہ پاسکے۔ کھانا کھانے سے پہلے یا رفع حاجت کے بعد اچھی طرح ہاتھ دھونے کے لئے یا تالاب کے پانی کو گندہ نہ کرنے کے لئے تو پیٹ کا بھرا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن ابھی ہم بڑے بڑے پوسٹر لگا کر اور ٹی وی اور ریڈیو پروگرام دے کر عوام کو سکھا رہے ہیں کہ پینے کا پانی کھلا نہ رکھیں' رفع حاجت کے بعد ہاتھ راکھ یا صابن سے دھوئیں۔ اور بہت سی از یں قبیل باتیں۔

''ارے رام بھروسے جی' تنی چاہ واہ پلایئے۔ دیکھ رہے ہیں نئی دیدی جی آئی ہیں۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے چپراسی کو پکارا جو بکریوں کو ہنکانے میں مشغول تھا۔ پھر سنیتا سے مخاطب ہو کر بولے'' یہاں کوئی نئی' جوائننگ' دیتا ہے تو مٹھائی لے کر آتا ہے۔ کل آپ مٹھائی لے کر ضرور آیئے گا۔'' انہوں نے بڑے فخر سے وبھوتی شرن کی طرف دیکھا۔ ایک ماسٹر صاحب لپک جھپک ہاتھ میں کیسٹ پلیئر لئے چلے آرہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے نئے آنے والوں کو اس کی تاریخ سے آگاہ کیا۔ یہ انسپکشن کے بعد سرکاری طور پر اسکول کو بطور انعام ملا تھا۔ انسپکٹر صاحب اسکول کے اساتذہ کی کارکردگی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی انتظامی صلاحیتوں سے اس قدر خوش ہوئے تھے کہ انہوں نے اس کی سفارش کی تھی اور روپیہ سینکشن کرایا تھا۔ ساتھ میں دیش بھگتی گیتوں کے چار

کیسٹ بھی ملے تھے۔ پلیئر بیٹری پر چلتا تھا ہر دو تین ماہ کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب 'چلے' سے ایک نیا کیسٹ منگوایا کرتے تھے اور اس طرح اب اسکول کے پاس دس کیسٹ تھے۔ بچے ان کے گانے سن سن کر خاصے عاجز آ چکے تھے۔

رام بھروسے جی نے باہر اینٹے جوڑ کر بنائے گئے چولہے پر المونیم کی کتیلی میں جو بالکل ان کی صورت جیسی ہو چکی تھی'' چاہ' کا پانی ابلنے کو چڑھایا اور ایک بکری کا دودھ دوہنے کی مہم میں جٹ گئے۔ ادھر ماسٹر جی نے کھٹیا پر اپنی جگہ محفوظ کی اور 'چلے' سے آیا ہوا نیا کیسٹ پلیئر پر چڑھایا۔ اچانک فضا میں 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' گونجنے لگا۔

''اب کی سوتنتر تادِوس پر بچوں کو یہی سکھائیں گے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

''سر' مگر ایک بات بتایئے۔ یہ ہمارے دیش کے بارے میں جو کویتا ہے اس میں سالا یہ جِنا کا نام کہاں سے چلا آتا ہے اور کیوں؟'' رسکے جِنا ہمارا۔'' اور اس کے مانی کیا؟ بڑا کشٹ ہوتا ہے ہم کو۔ دیش کا بٹوارا کرادیا اس آدمی نے۔ دس لاکھ ہندو کو کٹوادیا۔'' ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے۔

''اس پر تو سوچا نہیں ہم نے کبھی''۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سر کھجانے لگے'' مگر جب بھارت سرکار نے یہ بول اس میں سے نہیں ہٹایا تو ہم لوگوں کو کوئی آپتی نہیں ہونی چاہیے۔''

''سرکار کی بھلی کہی سر۔ سرکار تو مسلمانوں کا تشٹی کرن کرنے کے لئے جو نہ کرے وہ تھوڑا۔'' سنیتا کی موجودگی کی وجہ سے وہ گالی دیتے دیتے رک گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب تذبذب کے عالم میں نظر آئے۔'' مانی پوچھنا چاہئے کسی سے۔''

سنیتا نے حیرت سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ وبھوتی پھر کمینے پن کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ سنیتا سے رہا نہیں گیا اس نے ہیڈ ماسٹر کو مخاطب کیا۔'' سر' دیکھئے اس کویتا کی بھاشا ہے اردو۔ جناں کہتے ہیں سورگ کو۔ یہاں اس کا مطلب محمد علی جناح سے نہیں ہے رشک کے معنی ایرشا اس بول کا مطلب ہے کہ ہمارا دیش اتنا سندر رہے کہ اس پر سورگ کو بھی ایرشا ہو۔''

''آپ محمڈن ہیں؟'' ماسٹر صاحب نے کان کھڑے کر کے پوچھا

''نہیں بھائی۔ ان کا نام سنیتا بھٹناگر ہے اتہاس پڑھائیں گی۔ نیا پوسٹنگ ہوا ہے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے جلدی سے سنیتا کے حق میں صفائی دی۔

''اچھا'' ماسٹر صاحب کی آواز میں حیرت تھی۔ وبھوتی شرن اب باقاعدہ ہنس رہے تھے ہی ہی ہی۔

''آج اسکول دیکھ لیجئے کل سے پڑھایئے گا'' پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسسٹنٹ ماسٹر کی طرف مخاطب ہو کر کہا ''چاہ پی لیجئے تب بہن جی کو لے جایئے۔ سب گھر دکھا دیجئے گا۔ ویسے بہن جی آپ یہاں آنا جانا کیسے کیجئے گا؟ یہ ساتھ میں آئیں گے کیا؟'' انہوں نے وبھوتی بابو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں صاحب۔ بس راستہ دکھا دیا۔'' وبھوتی جلدی سے بولے۔ اب یہ خود آئیں گی۔ اور آنا جانا کریں یا یہاں رہنے کا کوئی صحیح انتظام ہو تو...''

''رہنا چاہیں گی تو انتظام ہو جائے گا۔ لیجئے بہن جی چاہ لیجئے۔'' چپراسی میلے میلے سے اسٹیل کے گلاسوں میں چائے لے آیا تھا۔

سنیتا کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے گفتگو آگے بڑھائی۔ ''بچے بہت کم دکھائی دے رہے ہیں۔ اسکول میں لڑکیاں آتی ہیں؟ کتنے پرسنٹ ہیں؟''

''دیکھئے بہن جی یہاں زیادہ تر غریب غربا کے بچے آتے ہیں وہ بھی زیادہ تر لیبر کلاس کے۔''

کیوں؟'' سنیتا نے آنکھیں اٹھائیں۔

'' لگتا ہے گاؤں سے کبھی آپ کا واسطہ مطلب نہیں رہا۔ افسر پتنی ہیں آپ؟'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے چڑ کر کہا

''ہم افسر کیا، کسی کی بھی پتنی نہیں ہیں۔'' سنیتا کی آواز میں بھی خفیف سی دھار تھی۔

''اوہ! مگر شہر کی تو ہیں۔ بڑے گھر کی بھی لگتی ہیں۔ آپ کی جانکاری کے لئے بتا رہے ہیں۔ یہاں گاؤں میں جو بھی آدمی تنِک صحیح ڈھنگ سے اپنے بچے کو پڑھانا چاہتا ہے یا پڑھانے کی حیثیت رکھتا ہے وہ بھیج دیتا ہے جلے کے اسکول میں۔ صرف پانچ کوس کی دوری ہے۔ بچہ آرام سے ڈیلی بس سے آتا جاتا ہے۔ وہاں انگریجی میڈیم اسکول بھی ہے۔ زیادہ تر لوگ تو یہی چاہتا ہے کہ بچے کو دور جانا ہے تو اسی میں جائے۔ بچتا ہے گاؤں کا چھوٹا موٹا آدمی اور لیبر کلاس۔ تو اس میں سے جس کو پڑھانے کی سدبدھی ہے اسی کا بچہ ہمارے یہاں آتا ہے۔ ابھی تو آپ اتنی رونق دیکھ رہی ہیں بوائی اور کٹائی کے وقت دیکھئے گا اس کا آدھا بھی آ جائے تو شکر منایئے گا بھگوان کا۔ آپ کا سارا آدرش واد شہر میں چلتا ہے وہ بھی بڑے شہر میں۔ سب میں نہیں۔'' انہوں نے بڑے جارحانہ انداز میں چائے سڑ پی۔

واپسی کے سفر میں وبھوتی بھوشن نے چھیڑا۔ ''کیسے لگے ہیڈ ماسٹر سر' کماری سنیتا بھٹنا گر جی؟ اب تو ہم بھی یہی کہیں کہ کسی مرد کی بانہہ تھام لیجئے اور بیٹھئے گھر میں آرام سے۔''

سنیتا جو بکری کے دودھ کی چائے پی کر ویسے بھی خراب موڈ میں تھی' جھلا گئی۔ ''بڑھوا' جُھل پونٹ' پاپا کی عمر کا ہے اور ایسے بہن جی' بہن جی کہہ رہا تھا جیسے ہم اس کی عمر کے ہوں۔ بھبھوتی بھائی صاحب' بس آپ سیدھے چل کر میڈیکل لیو کا انتظام کرا دیجئے جو خرچ ہوگا ہم دیں گے۔ ہو گئی جوائننگ''

''پھر؟''

''پھر کیا۔ پھر کوشش کیجئے کہ شہر میں ہی کسی اسکول میں ٹرانسفر ہو جائے۔ کہا نہ ہم سمجھیں گے سال چھ مہینے اور بیکار رہ لئے۔ اتنی رقم...''

''اور گاؤں میں کون پڑھائے گا میم صاحب؟'' وبھوتی شرن کا لہجہ تمسخرانہ تھا

''ہم نے ٹھیکہ لیا ہے گاؤں کا؟ کون سا ان میں نہرو گاندھی پیدا ہونے ہیں۔'' سنیتا کے لہجے میں اس کمپاؤنڈر جیسی بے دردی تھی۔

وبھوتی نے پلٹ کر دیکھا۔ کالے کلوٹے' ہونق' میلے کچیلے بچے۔ ناکافی کپڑوں میں ملبوس' دانت نکوسے۔ سنیتا کو اب بھی دور سے تک رہے تھے۔

''ہاں' سو تو ہے۔ پھر بھی بنیادی سوال رہ جاتا ہے کہ انہیں کون پڑھائے گا۔''

''انہیں وہی پڑھائیں گے جو کہہ رہے تھے کہ سارے جہاں سے اچھا میں یہ سالا جتا کا نام کہاں سے آ گیا۔ یا جایئے پڑھایئے آپ'' مارے کھسیاہٹ کے سنیتا کا جی چاہا واقعی ان کی مونچھیں اکھاڑ دے کیوں کہ وہ ڈھٹائی سے ہنسے جا رہے تھے۔

☆☆

نیا سال مبارک ہو

نئے سال کی شام کو دی جانے والی پارٹی کے سارے انتظامات مکمل تھے۔ بس صرف اپنے چہرے کی مرمت اور رنگ و روغن کے لئے بیوٹی پارلر جانا باقی رہ گیا تھا اور راستے سے کچھ خشک میوے خریدنے تھے۔ ثروت نے گاڑی گیراج سے نکالی ہی تھی کہ مالی کی بیوی دوڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ سرد ہوا کی بوچھار سے اس کا سانولا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پچھلے جاڑوں میں ثروت کی دی ہوئی پرانی شال اب کثرت استعمال سے پتلی پڑ چکی تھی۔ اسے کس کر لپیٹی، پھولتی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ عین گاڑی کے سامنے آ گئی۔

''کیا ہے جانکی؟'' ثروت نے جھنجھلاہٹ سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی جی، ہم اسپتال جا رہے ہیں۔ کچھ پیسہ پیشگی چاہیے تھا۔''

''کیوں رام رتن ٹھیک نہیں ہوا؟'' ثروت کو قدرے شرمندگی کا احساس ہوا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سوچ رہی تھی کہ مالی کی کوٹھری کی طرف جا کر اس کی خیریت پوچھے گی لیکن موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''ٹھیک نہیں ہیں، بی بی۔ بخار نہیں چھوٹ رہا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکال کر اس کی جانچ کریں گے۔''

وقت کی تنگی کا خیال کر کے ثروت نے مزید سوال جواب اگلے وقت کے لئے اٹھا رکھے، پرس سے سو کا نوٹ کھینچ کر جانکی کی طرف بڑھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''مالکن...''

''جانکی، اب بعد میں بات کرنا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' ثروت نے اسکی بات کاٹ دی پیشانی پر نصف گھونگھٹ درست کرتی جانکی وہاں سے ہٹنے لگی مگر اس کی حرکات سست تھیں اور چہرے پر مایوسی تھی۔ شاید اسے اور پیسے چاہئیں۔ ثروت نے پرس میں پڑے نوٹوں کا دھیان کیا اور کہا اچھا واپس آ کر دیکھوں گی۔ اس مرتبہ پارٹی میں اس کے شوہر نے ایک نئی پخ لگا دی تھی۔ وہ نہ خود پیتا تھا نہ اس کے گھر دی جانے والی پارٹیوں میں شراب پیش کی جاتی تھی لیکن اس مرتبہ دوستوں کی ضد اور اس دھمکی پر کہ وہ اس کے یہاں آئیں گے ہی نہیں، اسے جھکنا پڑا تھا۔ یوں ایک بڑا خرچ اور نکل آیا تھا۔ پھر یہ کہ پچھلے کئی مہینوں سے جانکی پیشگی کہہ کر جو رقم لے رہی تھی وہ کبھی منہا نہیں ہوئی تھی۔

شہر کے اس بڑے اور مہنگے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوتے ہوئے ثروت کی نظریں یکا یک اس موٹی عورت پر پڑیں اور اسے محسوس ہوا کہ چھینی لے کر جگہ جگہ سے گوشت چھانٹ دیا جائے تو ایک بڑی جانی پہچانی صورت باہر نکل آئے گی۔ آنکھوں کے گوشوں سے ثروت نے دوبارہ اسے دیکھا۔ وہ تقریباً اس کی ہم عمر تھی۔ یہی کوئی چالیس بیالیس یا ذرا سی کچھ زیادہ۔ اچانک ہی گوشت خود بخود چھٹ گیا اور ایک بڑی نازک اندام لڑکی باہر نکلی۔ نازک اندام اور کم سن۔ وقت بہت پیچھے لوٹ گیا۔

''ارے اُرمی۔!'' آس پاس کے لوگوں کا خیال کئے بغیر ثروت حیرت بھری مسرت کے ساتھ چیخی۔ اس عورت نے تیزی کے ساتھ پلٹ کر ثروت کو دیکھا۔ اگلے لمحے دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر تھیں۔ ارملا کا شوہر ایک بڑی پرائیوٹ فرم میں اونچا عہدہ دار تھا۔ حال ہی میں ان لوگوں کا ٹرانسفر دلی ہوا تھا۔ ارملا کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ثروت بھی دہلی میں ہی ہے۔ دونوں کی شادیاں ہو جانے کے بعد پہلے خط و کتابت سرپٹ دوڑی تھی، پھر لنگڑی لنگڑی چلی تھی اور پھر تھم کر وقت کی دھند میں گم ہو گئی تھی۔

مارے خوشی کے ثروت نے اپنا لیپا پوتی والا پروگرام ملتوی کر دیا۔ دونوں کناٹ پلیس کے ایک

ریستوراں میں بیٹھ گئیں۔ ماضی کی قندیل سے نکل نکل کر جگنوان کے گرد اڑنے لگے۔

اتنی موٹی کیسے ہوگئی ارمی؟

''کھا کھا کے۔'' ارملا نے سادگی سے کہا اور زور سے ہنس پڑی۔ وہی پرانی ہنسی۔

کھانا واقعی ارملا کی کمزوری تھا۔ ہوسٹل کے ڈائننگ ہال میں سب سے زیادہ ہنگامہ وہی کیا کرتی تھی۔ وہاں نان ویج (Non-veg) کے نام پر اکثر انڈوں کا سالن ملتا تھا۔ ایک ایک ابلا ہوا انڈا ہر لڑکی کی پلیٹ پر رکھ دیا جاتا اور شوربا اور تلے ہوئے آلو علاحدہ ڈونگوں میں۔ ثروت کی تو یہ دیکھتے ہی جان جل جاتی لیکن ارملا عرف ارمی کھانے کی ہر چیز دیکھ کر پل پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں نہ جانے کیسے ایک بکری گھس آئی۔ گول مٹول فربہ سی بکری۔ ارملا نے بڑی سنجیدگی سے کہا... ''دیکھ تو ثروت کیا عمدہ مٹن چلا آ رہا ہے۔ چل پکڑیں۔'' جب ٹیبل پر انڈے آتے ارملا پورا کھانا میز پر آنے سے پہلے اپنی پلیٹ کے انڈے تو کھا ہی جاتی' دو ایک اور لڑکیوں کی پلیٹ سے اٹھا کر بھی چٹ کر جایا کرتی تھی۔ پھر دوڑی چلی جاتی میس کی نگراں مسز ڈزنی سے شکایت کرنے۔ بوڑھی مسز ڈزنی خاصی خبط الحواس ہو چلی تھیں۔ بوکھلائی ہوئی ڈائننگ ہال میں میں چلی آتیں اور رونی صورت بنا کر کہتیں۔ انڈے کہاں جا سکتے ہیں لڑکیو! I laid them myself (میں نے خود دئے تھے) سارا ہال قہقہہ بار ہو جاتا۔ وہ بے چاری مزید بوکھلا جاتیں اور کچن میں جا کر اور انڈے ابلواتیں۔ بڑی ہی نیک تھیں۔ اور جتنی نیک تھیں اس سے زیادہ بھلکو۔ نہ جانے کب کی مرکھپ چکی ہوں گی۔

ارملا کچھ اداس ہوگئی۔ ''ان کا مرنا تو واجب ہوگا۔ بیس سال پہلے ہی لپٹا حریرہ تھیں۔ لیکن کچھ ایسے لوگ مر گئے جنہیں ابھی بہت دن زندہ رہنا تھا۔''

''کون ارمی!'' ثروت نے سانس روک کر جواب کا انتظار کیا۔ ایک لمحے کے بھی دسویں حصے میں نہ جانے کن کن لوگوں کے نام ذہن میں کوندھ گئے۔ اور ان کی مردہ صورتیں بھی۔

وہ سب پانچ تھے۔ ارملا' ثروت' جیوتی' راک ویل (پورا نام راک ویل سنگھ) اور آنند۔ وہ راک ویل کو اس طرح متعارف کراتے تھے۔ آپ سے ملئے آپ ہیں راک ویل' پورا نام راک ویل سنگھ۔ پھر اس احمقانہ انداز پر خود ہی ہو ہو کر کے ہنستے۔ ملنے پر راک ویل کی مزاج پرسی کچھ یوں کی جاتی ''ہائی راک ویل! راکنگ ویل؟'' (Rocking well) جواب میں وہ کسی

فلسفی کی طرح منڈیا ہلاتا اور کہتا ''ویری ویل سر (یا میڈم) ویری ویل'' پھر کسی اداس گدھے کی طرح لابنی تھوتھنی لٹکا لیتا۔ وہ سارے کے سارے بلاوجہ قہقہے لگاتے۔ ایک عمر تھی' ایک زمانہ تھا کہ ہنسی روئیں روئیں سے پھوٹا کرتی تھی۔

اتفاق سے گروپ کے دونوں لڑکے ڈے سکالر تھے اور لڑکیاں ہوسٹل میں تھیں۔ ان کی ملاقات روز کلاسوں میں ہوتی۔ یونیورسٹی کینٹین میں بھی وہ زیادہ تر ساتھ نظر آتے۔ کینٹین ملک بار کے نام سے جانی جاتی تھی اور وہاں کے دو سے مشہور تھے اور مونچھوں والا ہنس مکھ بیرا بشیر بھی۔ وہ اکثر ادھار دو سے کھاتے اور جاڑوں کی خوش گوار دھوپ میں گھاس پر بیٹھ کر مونگ پھلیاں چگتے۔ ایک مرتبہ ایک لفنگا سا دکھائی دینے والا اجنبی لڑکا اسکوٹر پر جاتے جاتے ان لوگوں کے بہت قریب آ کر رک گیا تھا اور بڑے بے ہودہ ڈھنگ سے آنکھ دبا کر بولا تھا'' تین لڑکیاں اور دو لڑکے' ہمیں موقع دیجئے' ہم توازن درست کر دیں گے۔'' اس نے اسکوٹر کا انجن بند نہیں کیا تھا پھر بھی وہ بھاگ نہیں سکا۔ آنند اور راک ویل نے پھرتیلے چیتوں کی طرح لپک کر اسے دبوچ لیا اور باری باری دو، دو جھاپڑیوں رسید کئے جیسے کوئی اہم فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ہائیں ہائیں کر کے لڑکیاں دوڑیں ورنہ وہ یوں ہی یہ فریضہ کچھ دیر اور انجام دیتے رہتے۔ آنند بہت گورا تھا۔ غصے اور شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

وہ سب کیسے معصوم چہرے تھے۔ نوجوان، تازہ، ہرے بھرے جیسے شاخ پر پھوٹی ہوئی نئی کونپلیں طالب علموں کی مخصوص باہمی وفاداری کی ڈور میں بندھے۔

''کمینہ! پتہ نہیں کون تھا!''

''ضرور لاء ڈپارٹمنٹ کا رہا ہوگا۔ سارے لفنگے ادھر ہی ملتے ہیں۔''

سب کو پتہ تھا ارملا کی شادی کی بات ایک وکیل سے چل رہی تھی۔ گرچہ بعد میں وہاں نہیں ہوئی لیکن اس وقت خاصی حد تک آگے بڑھ چکی تھی۔ ارملا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کھسیا کر گھاس توڑنے لگی۔ جیوتی نے زیرلب شادی کا گیت گنگنانا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں میں گہری مسکراہٹ تھی۔ ''لو یہ تو ابھی سے تنکے چننے لگیں۔''

ان بیس بائیس برسوں میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں اور سڑکوں پر لڑکے جس زبان میں لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں وہ ناقابل تحریر ہے۔ اس کے باوجود کوئی شریف لڑکا اٹھ کر

انہیں جھاڑ نہیں لگاتا۔ لگانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ سو شریف لڑکوں پر پانچ سات لفنگوں کا تناسب اب بالکل الٹ گیا ہے اور جو جہاں اکثریت میں ہے اور اقلیت کو روندنے کی صلاحیت رکھتا ہے' روندنا چاہتا ہے۔ ان بیس برسوں میں ہم نے کیا کچھ کھویا ہے۔ حیا اور شرافت کے ساتھ جینے کا حق تک۔ آنند سے جینے کا حق کس نے چھینا؟ وہ تو بہت بڑی بڑی باتیں کیا کرتا تھا' جینے کی امنگ سے بھرپور۔ ثروت گنگ ہو کر کافی میں چمچہ چلاتی رہی۔ ارملا کسی داستان گو کی طرح قصہ سنا رہی تھی۔ اسکا لہجہ افسردہ تھا۔ ''شادی کے بعد بیاہ کر میں ناگ پور گئی تھی یہ تو تجھے معلوم ہی ہے۔ پانچ سال وہاں رہی۔ پھر اچانک ارون کا تبادلہ لکھنو ہوگیا۔ وہاں آنند اور راک ویل سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور جیوتی سے بھی۔''

''جیوتی تو آگرے کی رہنے والی تھی'' ثروت نے بے صبری سے کہا۔ ''وہ بھی وہاں آ گئی۔ تم سب پھر مل گئے۔ ایک میں ہی علاحدہ ہوگئی۔''

''جیوتی کے لکھنو واپس آنے کا قصہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ ہمیں لکھنو آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔ ابھی پرانے دوستوں کو تلاش کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ میں امین آباد میں بچے کے دودھ کا ڈبہ تلاش کرتی گھوم رہی تھی کہ راک ویل ٹکرا گیا۔ مارے خوشی کے بھرے بازار میں میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ''واہ باس کیا ملاقات ہوئی ہے۔ قسم خدا کی۔ بس شام کو میتھڈسٹ چرچ آ جاؤ۔ آج میری شادی ہے۔'' میں نے کہا آج ہی شادی ہے تو یہاں کیا ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہو؟'' پتہ چلا دلہن کی انگوٹھی ابھی تک نہیں خریدی گئی ہے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹاٹا کرتا بھاگ نکلا۔ جاتے جاتے مڑ کر چلایا ''میتھڈسٹ چرچ۔ شام کو پانچ بجے۔'' بے حد خوش تھا۔ میں بچوں کو لے کر گئی ارون نے بڑی رکھائی سے جانے سے منع کر دیا تھا۔ خیر وہاں پہنچی اور دلہن کو دیکھا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ راک ویل کی شریر مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے کان تک۔

''دلہن جیوتی تھی؟''

''ہاں۔ کم بختوں نے کبھی بھنک تک نہیں لگنے دی تھی۔ میں تو خوب ہی لڑی۔ وہاں آنند بھی تھا۔''

''یہ تو بتاؤ اسے ہوا کیا تھا؟ کب مرا وہ۔ کیوں مرا' کیسے مر گیا؟'' ثروت کی آواز میں بے قراری تھی۔ کافی کے پیالے پر اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

''ہم دونوں نے تو گریجویشن کے بعد یونیورسٹی چھوڑ دی تھی لیکن آنند نے ایم اے جوائن کر لیا تھا۔ اس وقت ایم اے کئے ہوئے بھی اسے تین سال ہو چکے تھے لیکن وہ کسی مستقل روزگار سے نہیں لگ سکا تھا۔ انگریزی اچھی تھی، اخباروں میں کالم لکھتا رہتا تھا اور شام کو ایک پرائیوٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ میں کلاسیز لیتا تھا۔ ارون کہتے تھے کن پھٹیچر لوگوں سے تمہاری دوستی رہی ہے تب میں نے انہیں بتایا کہ ایک بہت بڑے' دولت مند، ملیح آباد کے پرانے زمینداروں کے گھرانے کی لڑکی ثروت سے بھی میری گہری دوستی تھی۔ ہاں اگر دوستی کا معیار دولت اور خاندان کو ہی مانیں تو۔''

''اور شادی کا معیار؟'' ثروت کے دل میں پھانس سی چبھی۔ ابا میاں ثروت کے یونیورسٹی جانے کے سخت خلاف تھے۔ قصبے میں سخت پردے میں رہ کر اس نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا مگر دونوں بھائی بڑے روشن خیال تھے۔ انہوں نے اپنی دلیلوں سے ابا کو چاروں خانے چت کر دیا۔ بڑے بھیا اسے کیلاش ہوسٹل چھوڑ کر جانے لگے تو بولے تھے ''ثروبیٹا' تم میری ضد پر سات پردوں سے نکل کر سیدھی ایک مخلوط تعلیم والے ادارے میں آ گئی ہو۔ جیسے تلاؤ کی مچھلی چھوٹ کر سمندر میں آ گرے۔ ایسی کوئی بات نہ کرنا کہ مجھے ابا میاں سے شرمندہ ہونا پڑے اور...'' کیننگ کالج کی برجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا'' اس عظیم ادارے سے بھی۔''

آنند کی دوستی کو چاہت میں بدلتے دیکھ کر ثروت ڈر گئی تھی اور اس نے اپنے دل کے چاروں طرف ایک فولادی دیوار تعمیر کر لی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر اسے بے قوف ٹھہراتی رہتی تھی۔ بے قوف اور جذباتی۔ ایک دن وہ بہت سنجیدہ ہو گیا۔ سنجیدہ اور اداس۔'' جانتا ہوں تمہارے اور میرے درمیان جو دیوار ہے اس میں میں کبھی روزن نہیں بنا سکوں گا۔'' اس لمحے وہ گورا' لانبا' گٹھے ہوئے جسم والا' فٹ بال کا بہترین کھلاڑی کیسا بے چارہ لگ رہا تھا۔ بے بس و بے چارہ۔ بے اختیار جی چاہا اس کے گلے سے لگ جائے۔ اسے تسلی دے لیکن اس خواہش کا گلا گھونٹ کر وہ ہنسنے لگی تھی۔ ''آنند' ایک دن اپنے آنگن میں بیٹھ کر اپنی بیوی کے ہاتھ کی بنی چائے پیتے ہوئے جب اپنی حماقتوں کے قصے سنا رہے ہو گے تو ان میں میرا بھی ذکر آئے گا۔'' اس دن کے بعد سے آنند نے اپنی کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ثروت کی ہنسی اسے کہیں اندر تک کچوٹ گئی تھی مگر وہ ہمیشہ بہت اچھا دوست رہا تھا۔ ذہین اور بذلہ سنج۔ ہر کی مدد کو حاضر۔ بے حد محنتی۔ پھر زندگی کی ہماہمی میں اس کا

چہرہ دوسرے چہروں کی بھیڑ میں گم ہوتا چلا گیا۔شوہر کے ساتھ ثروت دل کی کسک دل میں دبائے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ایک کے بعد ایک تین بچے۔دل کی حدوں سے باہر آ کر اس کسک نے آج پھر اس کے پورے وجود کو گھیر لیا تھا۔

''ارمی' بتاؤ نہ آنند کیسے چلا گیا؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟'' کہتے ہوئے اسے لگا جیسے اس کے اندر برف گر رہی ہے اور ہاتھ پیر شل ہوتے جا رہے ہیں۔

''تمہیں آنند کی چھوٹی بہن یاد ہے؟ ہم لوگ آرٹس فائنل ایئر میں تھے۔اس نے بی ایس سی پارٹ ون میں داخلہ لیا تھا۔ہم لوگ کبھی کبھی اس سے ملنے سائنس فیکلٹی جاتے تھے۔''

ثروت دل ہی دل میں جھنجھلائی۔یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔آنند کی بہن کہاں آ گئی درمیان میں، لیکن اس نے صبر کے ساتھ کہا۔''خوب یاد ہے۔آگے بولو۔''

''وہ پیاری سی' نازک' ہری دوب سی سائنس گریجویٹ جلا کر ماردی گئی۔''

ثروت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔وہ کچھ بول نہیں سکی۔

''اس کے سسرال والوں نے کہا تھا ہمیں جہیز نہیں چاہئے' ہم لڑکی کو تعلیم اور خوبصورتی پر لے جا رہے ہیں۔لیکن پھر بھی آنند اور اس کے والدین نے جو ہو سکتا تھا' دیا تھا۔فرنیچر' ریفریجریٹر جیسا سارا انگڑ کھنگڑ اور موٹر بائیک بھی۔شادی کے بعد انہوں نے اصل رنگ دکھایا۔آئے دن فرمائشیں لیکن وتسلا نے نوکری کرنی چاہی تو وہ نہیں کرنے دی۔کہا ہمارے گھر کا رواج نہیں کہ بہو بیٹیاں نوکری کرتی پھریں۔بہو کو جلا کر مار دینا شاید ان کے گھر کا رواج تھا۔اسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔

وتسلا کو جلا ہوا میں نے خود دیکھا۔کنگ جارج کے برن وارڈ میں پورے اڑتالیس گھنٹے وہ زندگی اور موت کے درمیان جھولتی رہی۔مہینوں مجھے نیند نہیں آتی تھی۔آنند تو بھائی ہی تھا اور بھائی بھی کیسا کہ سب سے محبت کرنے والا۔اس حادثے کے وقت وہ مختلف نوکریوں کے لئے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھ رہا تھا۔نتیجہ ظاہر تھا۔ہر جگہ فیل ہوا۔وہ کالج والی نوکری تھی لیکن وہاں پیسہ بہت کم ملتا تھا۔ماں دل کی مریض پہلے سے تھیں اب ان کا مرض شدت اختیار کر گیا۔اسی دوران آنند کو یرقان ہوا جو پیچیدہ صورت اختیار کر گیا۔ڈاکٹروں نے اسے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ، دلی لے جا کر علاج کرانے کی رائے دی۔کچھ رقم اس کے باپ کے پاس تھی۔کچھ انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے لینے کی بات کی، لیکن آنند نے اپنے علاج پر روپیہ خرچ کرنے کے بجائے

چھوٹے بھائی کی تعلیم کے لئے پس انداز کرنا مناسب جانا۔ وہ کبھی دلی نہیں گیا۔ وہیں مر گیا لکھنو میں ہی۔''

آنسوؤں کی چلمن کے پیچھے سے ثروت نے ارملا پر نظر ڈالی۔ ''گومتی کے کنارے بہتی ہوائیں اس کی چتا کی راکھ اڑا لے گئیں اور تم نے کچھ نہ کیا ارملا؟''

''ثروت۔ ہم لوگ بہت کم ہی ایک دوسرے سے مل پاتے تھے۔ میرا اپنا کنبہ تھا۔ دھوپ میں بیٹھ کر مونگ پھلیاں چگنے اور ایک دوسرے کے دلوں میں جھانکنے والی بے فکری اب کہاں تھی۔ مجھے تو یہ تک نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی بیماری سنگین صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ویسے ثروت'' ارملا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''میں دولت مند شوہر کی بیوی ضرور ہوں لیکن ارون کی مرضی کے خلاف گھر میں پتہ بھی نہیں کھڑکتا۔ اچھا ہی ہوا جو میں انجان رہی۔ جاننے پر بھی کیا اسے ایک بڑی رقم اٹھا کر دے سکتی تھی؟''

''ہاں، ہم بچوں کی برتھ ڈے پارٹیوں اور منگنی، شادی کے ہنگاموں اور غیر ملکوں کے تفریحی چکر لگانے جیسے کاموں پر ہزاروں ہزار پھونک سکتے ہیں لیکن ہمارے بہت سے عزیز' احباب' پڑوسی صرف اس لئے مر جاتے ہیں کہ ان کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں ہوتا۔'' ثروت نے دھیرے سے کہا۔

''اور جب مر جاتے ہیں تب بڑا رنج ہوتا ہے۔ پھر وقت سب پر مٹی چڑھاتا گذر جاتا ہے اور وہ سب یوں بھلا دیئے جاتے ہیں جیسے آنند۔ اس کے گذر جانے پر ہم سب بہت روئے تھے۔ کئی دن لگاتار اس کے گھر بھی جاتے رہے۔ بیتی باتیں دوہراتے رہے لیکن اب تو بارہ چودہ سال گذر چکے ہیں۔ اولاد کو چھوڑ کر باقی سب کا صبر آ جاتا ہے۔ زندگی جیٹ کی رفتار سے رواں دواں رہتی ہے۔''

''آج میرے گھر بھی ایک بڑی پارٹی کا اہتمام کیا گیا ہے۔''

''ہاں کل نیا سال شروع ہے۔''

''اس کے علاوہ توصیف کو حال ہی میں ایک بڑا پرموشن بھی ملا ہے۔ اسکی پارٹی کا تقاضہ بھی تھا۔ مگر دل کیسا بوجھل ہو گیا۔ مجھے لگ رہا ہے میں کچھ نہیں کر سکوں گی ارمی۔''

''دل کا بوجھ دل تک رکھنا ثرو۔ میں آنند سے بہت خوش ہو کر ملتی تھی۔ اسی کا انتظار کیا کرتی تھی۔ تم جانتی ہو وہ کس قدر ہنستا تھا۔ ایک دن ارون نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ارے وہ' اس

کا فون آیا تھا۔ وہی تمہارا اولڈ فلیم (old Flame)۔ ہوسکتا ہے بات مذاق میں کہی گئی ہو لیکن اس کا لہجہ کسی مذاق کا غماز نہیں لگا اس کے بعد سے میں بہت محتاط ہو گئی۔''

ثروت ہنس پڑی۔ ایک کھوکھلی سی ہنسی۔ ''آج اتنے زمانے بعد شاید توصیف ایسا کچھ نہ سوچ سکے مگر ہاں میں اپنے کسی پرانے ہم جماعت کے لئے' جس کو مرے ہوئے بھی چودہ پندرہ برس گذر گئے' اس کی پارٹی کا مزا کرکرا کر دوں' یہ وہ نہیں برداشت کرے گا۔''

انہوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر اور پتے لئے۔ چلتے چلتے ثروت پلٹی۔ اسکی ویران آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں'' کیا واقعی ایسی پیاری سی معصوم لڑکی کو کوئی جلا کر مار سکتا ہے' ارملا سچ کہنا۔''

''ہوسکتا ہے آج ابھی' اسی وقت کوئی اور بھی معصوم لڑکی اس لئے جلائی جا رہی ہو کہ اس کے سسرال والوں کو مرضی کے مطابق جہیز نہیں مل سکا تھا۔ روزانہ اوسطاً آٹھ سے دس لڑکیاں اسی طرح جلا کر ماردی جاتی ہیں۔ اور کتنے ہونہار شریف لڑکے اس لئے مرجاتے ہیں کہ ان کے پاس معقول ذریعہ معاش نہیں ہوتا یا بیماری میں علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔'' ثروت کا لہجہ تلخ تھا۔

''یہ اعداد و شمار میرے پاس نہیں ہیں ثروت۔''

اعداد و شمار شیاما چرن کے پاس رہا کرتے تھے۔ بور کہیں کا۔ ہمیشہ اگلتا رہتا تھا۔

کوئی پندرہ جوڑوں کی پارٹی میں وہ اکیلا کنوارا تھا۔ نصف سنچری ٹھوک چکا تھا پھر بھی تنہا۔ ڈرنکس کے لئے بھی سب سے زیادہ ادھم اسی نے مچا رکھا تھا۔ ''تم جرنلسٹوں کو مفت کی پینے کی عادت ہو جاتی ہے۔'' ثروت نے ایک بار چڑ کر کہا تھا لیکن اس نے ذرا برا نہیں مانا تھا۔ اس وقت شیاما چرن سمیت کوئی بیس لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں جام تھے۔ بس کچھ خواتین نے گریز کیا تھا اور ثروت کے شوہر نے۔ بڑا حسین سماں تھا۔ کئی جگہ آگ روشن تھی۔ اکتیس دسمبر کی یخ بستہ رات کو وہ سب چھوٹے چھوٹے جھرمٹ بنا کر الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ سیخوں پر مرغ بھن رہے تھے۔ گول مٹول اور فربہ۔ گھی اور مسالوں کی خوشبو ثروت کے لان کی ہری دوب کی مہک کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ غزالی آنکھوں والی خوبصورت' نوجوان کچی دوب سی وتسلا کو لوگوں نے یوں ہی بھون دیا تھا۔ انسانی گوشت کی چراند سارے محلے میں.... ثروت کو منھ بھر کر ابکائی آ گئی وہ گھبرا کر دوسری

طرف دیکھنے لگی۔

''کیاانتظام کیا ہے بھابی۔ ماشاءاللہ۔'' شیاما چرن کہہ رہا تھا۔

''ابے ہندو ہو کر کیا انشاءاللہ، ماشاءاللہ کرتا رہتا ہے۔ بھگوے جھنڈے والے پکڑ لے جائیں گے تجھے۔'' کھلر نے شیاما کے کاندھے پر ایک دھپ رسید کیا اور زور سے قہقہ لگا کر ہنسا۔

''یہ ہندو ہے؟'' توصیف نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ ''مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا ورنہ اب تک اس کا گلا کاٹ چکا ہوتا۔''

''1990 کے فرقہ وارانہ فساد میں ۴۶۵ لوگ مارے گئے۔ سرکاری آنکڑے۔ ایک اور کا گلا کاٹ دے گا تو تو کون سا تیر مارے گا۔'' شیاما چرن نے اپنے حصے کے چوزے کی سیخ کو آنچ پر گھمایا۔

''اگلے ماہ ریتا کی شادی کی تاریخ طے کرنی ہے۔'' مسز کھلر کہہ رہی تھیں۔ ''حیدرآباد جانا ہے وہاں موتی سستے ملتے ہیں اور عمدہ بھی۔ یہ میں وہیں سے لائی تھی۔'' اپنے گلے میں پڑی سچے موتیوں کی لڑی کو انہوں نے انگلیوں پر گھمایا۔

مرغ کی ٹانگ بھرے منھ سے شیاما چرن کہہ رہا تھا'' ۱۹۹۸ء میں صرف مئی کے مہینے میں پنجاب میں ۲۹۱ لوگ مارے گئے۔ مئی ۱۹۹۰ء میں یہ تعداد ۸۸۲ ہو گئی، اس سال کی گرمیوں میں ۵۶۴ افراد مارے گئے۔ ماشاءاللہ کیا ترقی ہے۔ انشاءاللہ اگلی مئی میں ہم ان اعداد وشمار کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں گے۔''

''یہ مرد جہاں بیٹھیں گے اسی طرح کی بکواس کریں گے۔'' تہمینہ امجد نے منھ بنایا۔ ''مسز کھلر آپ حیدرآباد جائیں تو مجھے بھی خبر کیجئے گا۔ آپ سے میں بھی موتی منگواؤں گی۔''

''یار چپ بھی رہ۔'' مردوں میں سے کسی نے شیاما چرن سے کہا۔

''اور شادی کر ڈال۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔''

''کس سے کروں۔ ہندستان کی آبادی سے دوملین لڑکیاں غائب ہیں۔ کنواروں کی تعداد ویسے بھی بڑھے گی۔''

''ہندستان کی ترقی کے نام'' مہندر نے اپنا گلاس بلند کیا۔ ارغوانی شراب سے بھرا گلاس۔ سرخ خون کی رنگت۔ آسام کا خون۔ کشمیر کا خون۔ جیتے جاگتے انسانوں کا جیتا جیتا لہو۔ دھرتی

میں ملتا' پانی کو سرخ بناتا۔

گھڑی کی سوئیاں بارہ پر پہنچ رہی تھیں۔ چاروں طرف پٹاخے پھوٹنے لگے۔ ہر طرف آدم کے بیٹے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ یوگوسلاویہ' روس' عراق' بموں کے دھماکوں سے دنیا دہل گئی تھی۔ ''ساری دنیا ایک کنبہ ہے۔'' کسی بے قوف نے چار ہزار سال پہلے کہا تھا۔

ثروت کے سر پر ایک راکٹ شائیں کی آواز کرتا گذر گیا۔ ایک شور بلند ہوا'' نیا سال مبارک ہو'' سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ مبارک ہو' مبارک ہو۔ چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ چپکا کر لوگوں نے ایک دوسرے کو بلا وجہ مبارک باد پیش کی۔

''پھر بکھار چڑھ رہا ہے ردھیا کے بابو؟'' جانکی نے بیمار شوہر کی پیشانی چھو کر متفکر ہو کر کہا۔ اب تو شاید ہی مالکن اور پیسہ دیں۔''

''نیا سال مبارک ہو۔'' پٹاخوں کے دھماکوں کے ساتھ یہ شور ان کی کوٹھری میں بھی گھس آیا تھا۔ مالی زور سے کراہا۔

''بلا برا لگتا ہے ردھیا کے بابو؟ تھوڑی دیر میں شانت ہو جائے گا پھر سب ویسا ہی رہے گا' پہلے جیسا۔'' اس نے شوہر کو تسلی دی۔

☆☆
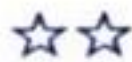
بلّی کا بچہ

وہ چار تھے۔ گول مٹول، صحت مند، صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، چمکتے چہرے۔ جوتوں پر تازہ پالش، کاندھوں پر بھاری بھاری بستے۔ بارہ سے چودہ سال کی عمریں۔ ان کا اسکول ان کے رہائشی علاقے کے بہت پاس تھا اس لئے وہ نہ بس لیتے تھے اور نہ سائیکل، مزے سے پیدل چلتے ہوئے اسکول پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان کے والدین نے کئی مرتبہ کہا کہ وہ سائیکل سے جائیں لیکن انہوں نے خود پسند نہیں کیا۔ راستے کی وہ ساری دلچسپیاں جو ان کا دن خوشگوار بناتی تھیں، سائیکل پر جانے سے سرسراتی گذر جاتیں۔ شاید وہ انہیں جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پاتے۔ مثال کے طور پر دینو کاکا کے کٹہل کے پیڑوں پر لگا بھڑوں کا چھتہ۔ اس پر بڑا سا پتھر پھینک کر، بستوں سے چہرہ چھپا کر تیزی سے بھاگ نکلنے پر وہ چاروں کیسے اُلوہی انبساط سے دوچار ہوئے تھے۔ طیش میں آئی بھڑیں پہلے تو مالی سے لپٹیں اور پھر صورت حال کا جائزہ لینے آئے دینو کاکا سے۔ اور تو اور وہ مالی کی بے چاری جمنا پاری بکری کالی کے لمبے لمبے کانوں میں بھی لٹک گئیں۔ غریب کے کان سوج کے کپّا

ہو گئے ۔ یہ ساری اطلاعات روح کو تر کر گئیں ۔ ہنس ہنس کے وہ کئی دن لوٹتے رہے ۔

دینو چچا کا باغ اسکول سے تھوڑا پہلے پڑتا تھا ۔ اس میں امرود، کٹھل ،انار اور شفتالو کے پیڑ تھے ۔ مالی نہایت موٹا تھل تھل تھا ۔ ڈنڈا لے کر دوڑتا تو کسی کارٹون فلم سے باہر آیا ہوا کیرکٹر لگتا ۔ وہ کبھی انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ بھی نہیں پاتا تھا ۔ چاہے انہوں نے پتھر مار مار کر کچی امیوں کا پٹرا کیا ہو، چاہے طوطوں سے بھی زیادہ امرود کاٹ کاٹ کر گرائے ہوں، چاہے کٹھل توڑ کے باغ کے تالاب میں پھینک دئے ہوں ۔ وہ تتلیوں سے زیادہ سبک تھے، ہرن سے زیادہ تیز رفتار اور لومڑیوں سے زیادہ شاطر ۔ وہ انسانوں کے بچے تھے، ساری حیوانی خصلتوں سے آراستہ ۔ روز کی طرح وہ آج بھی چلے جارہے تھے ۔

ایک بڑا سا گڈھا تھا ۔ ایک دم سے گرتا ہوا نہیں بلکہ دھیرے دھیرے نیچے اترتا ہوا ۔ کسی تعمیر کے دوران مزدوروں نے یہاں سے مٹی کاٹی تھی ۔ برسات آئی تو اس کی مٹی نم ہو گئی اور تہہ میں کیچڑ بھی بیٹھ گئی ۔ جب وہ چاروں وہاں سے گذرے تو بلی کا بچہ ابھی بالکل تہہ تک نہیں پہنچا تھا ۔ نم مٹی میں احتیاط سے پنجے جماتا وہ کنارے کنارے چل رہا تھا ۔ پھر بھی نصف گہرائی اس نے ضرور طے کر لی تھی ۔

نہ جانے کیوں ایسا ہوا تھا کہ وہ چھوٹا سا بچہ اپنی ماں سے الگ ہو گیا تھا ۔ شاید اس نے خود کو اتنا بڑا سمجھ لیا تھا کہ دنیا کا جائزہ لینے نکل پڑے ۔ یا شاید ماں نے اس کا دودھ چھڑا دیا تھا اور اسے دھکا دے کر بھگا دیا تھا ۔ یا پھر کسی نے ماں کو مار ڈالا تھا اور بچے سے اس کا زرہ بکتر چھن گیا تھا ۔ امکانات بہت تھے اور وہ کسی امکان کے تحت یہاں آنکلا تھا ۔ صحیح امکان کا پتہ لگانا تو مشکل تھا بس یہ جان لینا آسان تھا کہ وہ ایک بلی کا بچہ تھا جس کے دانت اور پنجے اس کی دفاع کے لئے کافی نہیں تھے اور وہ اس گڈھے میں آن پھنسا تھا ۔ شاید وہ دھیرے دھیرے کر کے اس میں سے نکل بھی جاتا لیکن تبھی ان چاروں میں سے ایک کی نظر اس پر پڑ گئی ۔

''بلی کا بچہ!'' وہ چیخا

''کہاں؟'' جو جوتے کی نوک سے کنکر اڑا رہا تھا، اچانک رک گیا ۔

"یہ دیکھو...... نیچے دیکھو نا۔" بلی کے بچے کو 'دریافت' کرنے والے نے کہا۔
"ارے ادھر گڈھے میں۔"

باقی تینوں نے جھک کر دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ بلّی کے بچے نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر کھیلتی سفا کی کا عنصر اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اسے کسی خطرے کی بو محسوس نہیں ہوئی۔ اپنے ہی جیسے ان بچوں کی طرف دیکھ کر بڑے ہی مسرور لہجے میں اس نے کہا 'میاؤں' جیسے کہہ رہا ہو "ہلو، کیسے مزاج ہیں؟" وہ ایک گھریلو بلی کا بچہ تھا۔ کالا سفید اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اپنے آس پاس انسانوں کو دیکھنے کی اسے عادت تھی۔

لڑکوں میں سے ایک نے پتھر اٹھایا اور بلی کے بچے کی طرف پھینکا۔ یہ پتھر اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ حیرت بھری اضطراری حرکت کے تحت وہ کود کر دوسری طرف بھاگا۔ گرچہ اس ننھے سے بلی کے بچے کے وزن کی کچھ اوقات نہیں تھی لیکن ڈھلان کی وجہ سے وہ پنجوں کو اچھی طرح جما نہیں سکا اور خاصہ نیچے سرک گیا۔ چاروں لڑکے زور سے ہنسے۔ پھر ان سب نے جھک کے پتھر اٹھائے اور ایک ساتھ پھینکے۔ یہ ایک ناگہانی افتاد تھی جیسے زلزلہ آجائے، کسی ندی کا بند ٹوٹ جائے یا فساد پر آمادہ لوگ اچانک گھر گھیر لیں۔ بوکھلاہٹ میں وہ تیزی سے گول گول گھومنے لگا اور مزید نیچے پھسل گیا۔ تبھی دھیان چند شرما ادھر سے گذرے۔

گذر تو اور لوگ بھی رہے تھے گرچہ وہ ایک پتلی سی ذیلی سڑک تھی۔ لیکن آج کل تو لوگ جہاں جگہ ملے چل رہے تھے اور جگہ نہ ملنے پر زبردستی جگہ بنا رہے تھے۔ خیر، تو شرما جی بھلے مانس تھے اور اپنے سماجی سروکاروں کے تئیں خاصے ذمہ دار بھی۔ اسکول کی یونیفارم میں ملبوس یہ لڑکے ہاتھ میں پتھر اٹھائے اسکول کے اوقات میں سڑک پر کھڑے بھلا کیا کر رہے ہیں۔ یہ جاننا اور پھر لڑکوں کو تنبیہ کرنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ (گرچہ اس طرح فرائض کی انجام دہی کو پھٹے میں ٹانگ اڑانا بھی کہا جاتا ہے۔) انہوں نے سارس کی طرح گردن اچکا کر دیکھا لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ 'لگتا ہے یہ لونڈے مینڈکوں پر پتھر چلا رہے ہیں' انہوں نے سوچا لیکن ایک بزرگ کی

حیثیت سے ان بھگوڑے لڑکوں کو نصیحت کرنا اپنا فرض گردانا۔" ارے بھیا جاؤ اسکول ورنہ ماسٹر صاحب ڈنڈے سے خبر لیں گے۔"

"ہماری خبر لینے والا کوئی نہیں پیدا ہوا۔" ان میں سے ایک نے کہا اور باقی ہی ہی کر کے ہنس پڑے۔ دوسرے نے کہا" چچا، چشمہ ناک سے سرکا جارہا ہے، دیکھئے، دیکھئے گر نہ پڑے۔"

ایک اضطراری حرکت کے تحت شرما جی کا ہاتھ ناک پر چلا گیا جبکہ چشمہ قطعی نیچے نہیں سرک رہا تھا۔ چشمہ اوپر سرکاتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ وہ خاصے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے زمانے کے ماسٹر صاحبان بیشک خطا کار لڑکوں کی خبر ڈنڈے سے لیتے رہے ہوں لیکن اب لڑکوں نے نہ صرف ان کا ڈنڈا توڑ کر پھینک دیا ہے بلکہ ماسٹر جی خود اسکول دیر سے پہنچنے لگے ہیں۔

بلی کا بچہ اب خوفزدہ نہیں بلکہ دہشت زدہ ہو چکا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی نارمل یا خوشگوار صورتحال نہیں ہے۔ اس کی حرکات وسکنات بھی نارمل نہیں رہ گئی تھیں۔ پہلے تو اس نے چکر کاٹے۔ ادھر ادھر گرتا پڑتا جائے فرار یا جائے پناہ ڈھونڈتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی نظر نہ آنے پر اس نے اپنی دم کو جسم کے گرد لپیٹ لیا اور سر کو پنجوں میں چھپا کر بالکل گیند جیسا گول بن گیا۔ اپنی دفاع کے لئے اس کی سمجھ میں اس وقت یہی ایک طریقہ آرہا تھا۔

"ہش ہش ہش..." مسرور بچوں نے اپنے اندر ہی اندر گھستے ہوئے بلی کے بچے کو کھولنا چاہا۔ بچے نے ایک دردناک آواز نکالی لیکن ٹس سے مس نہ ہوا۔ خوف اور بےبسی کے شدید احساس نے اس کے اعضا منجمد کر دئے تھے۔

اب کے دو چار راہ گیروں کے ساتھ ادھر سے حاجی بغلول گذرے۔

حاجی بغلول نہ تو حاجی تھے اور نہ ہی کچھ ایسے بغلول کہ انہیں یہ نام دیا جائے۔ شاید یہ نام اس لئے پڑا ہو کہ وہ لمبا کرتا پہنتے تھے اور سادھو جیسی کاکلیں اور داڑھی رکھتے تھے لیکن ایک نکتہ پھر یہ تھا کہ کاکلوں، داڑھی اور حاجی بغلول جیسے لقب کے ساتھ جس عمر کا تصور ہے وہ اس پر پورے نہیں اترتے تھے۔ جوان آدمی تھے بلکہ

نوجوان۔ محلے کے لڑکوں کے ساتھ ان کی خوب پٹتی تھی۔ وہ ایک دوکان پر سیلز مین کا کام کرتے تھے۔ اکثر بچوں کو ایک آدھ ٹافی مفت بھی تھما دیا کرتے تھے۔ اس وقت انہوں نے اپنے کندھے پر پڑا موٹی ستلی میں پرویا لالٹین کی چمنیوں کا ہار ذرا مضبوطی سے پکڑا اور لڑکوں کے پاس آگئے۔

''کسے پتھر مار رہے ہو جی؟''

''مار کہاں رہے ہیں؟'' لڑکوں نے دانت نپورے۔

''تو؟''

''ارے چچا جایئے دوکان پر، دیر ہو رہی ہے۔ یہ دیکھئے یہ بلی کا بچہ گڈھے میں گر گیا ہے ہم اسے نکالنے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں۔ گڈھا گہرا ہے نہ۔''

حاجی بغلول نے انہیں بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اس طرح کی چنڈال چوکڑی جہاں دکھائی دے جائے وہاں کسی خیر کی گنجائش کم نظر آتی ہے، شر کی زیادہ۔ پھر ان کی نظر لڑکوں کے ہاتھوں پر پڑ گئی۔ چار میں سے دو کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور تیسرے نے اپنے ہاتھ کا پتھر شرماحضوری میں بس اسی وقت نیچے گرایا تھا۔

''کیا یہاں پتھر مار مار کے اس غریب بلی کے بچے کو باہر نکالو گے؟'' انہوں نے کہا پھر سوچا کہ بڑے ہی بدمعاش ہیں سب کے سب۔ کل انہیں کی وضع کے دو چار اور کھڑے پلوں کے گلے میں رسی باندھ کر گھسیٹ رہے تھے جبکہ ہفتہ بھر پہلے ہی اسکولوں میں یوم انسداد بے رحمی منایا گیا تھا۔ شہر میں جگہ جگہ کئی لوگوں نے تقریریں کی تھیں۔ اس پر ایک صاحب یہ بھی بولے تھے کہ کیا جانوروں کے لئے ہم اپنے گھر خالی کر دیں کہ آؤ بندرو، بلیو، چوہو، سانپو، چلو ہم سڑک پر آجاتے ہیں۔ تم اپنے اپنے بل اور بھٹ چھوڑ کے ہمارے گھروں میں رہو۔ ویسے ہی جہاں دیکھو جانور ہی جانور۔ رات کو راستہ چلنا دشوار ہے۔ جہاں دیکھو کتے ٹانگ لینے کو تیار۔ گیئں ہیں تو دن میں ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بیچ سڑک میں جگالی کرتی آرام فرما رہی ہیں۔

''اب بھئی، ہم یہ تھوڑے کہہ رہے ہیں۔'' مقرر نے وضاحت کی۔ ''ہم تو صرف اتنا کہہ رہے ہیں کہ جو تم سے کسی عنوان کمزور ہیں ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک نہ

کرو۔اب بچے ہیں تو پتھر مار مار کے پلّوں کے ہاتھ پیر توڑ دیتے ہیں، گوالے ہیں جو بوڑھا ہو جانے پر گیا کو سڑک پر چھوڑ دیتے ہیں......''

''یا قصائی کو بیچ آتے ہیں...'' کسی نے لقمہ دیا۔

''کھانے کے لئے جانور ذبح کرنا اور بات ہے۔ڈنڈے مار مار کر اسے زخمی کرنا، چارے بھوسے کو ترسانا، بیلوں پر بے تحاشہ وزن لادنا...''

جتنے مونہہ اتنی باتیں۔تقریر کم کٹ حجتی زیادہ۔پھر بھی مقرر کی بہت سی باتوں پر تالیاں بجیں۔لوگوں نے اتفاق رائے کے طور پر گردنیں ہلائیں۔مگر جگہ جگہ پھر وہی لڑکے دیوالی میں کتے کی دم میں چھچھوندر باندھتے، پلوں کو پتھر مار مار کے رگیدتے اور وہ...وہ روز کا نظارہ رمیا۔بیل گاڑی میں جتے بیلوں پر منوں وزن لاد کے سڑاک سڑاک چابک مارتا ہوا۔لو، کراؤ انسداد بے رحمی۔وہ بھی جانوروں کے تئیں بے رحمی۔اجی یہاں انسانوں کے خلاف بے رحمی کا انسداد تو ہو نہ سکا۔

لڑکوں کو ٹوک کے حاجی بغلول نے کمزوروں کی حفاظت کے تئیں اپنا فرض نباہ لیا تھا اس لئے انہوں نے اپنی مینڈک جیسی ناک سکوڑی اور چمنیاں سنبھالتے آگے بڑھے۔دوکان کھلنے کا وقت ہو رہا تھا۔بجلی ہمیشہ غائب رہنے کی وجہ سے موم بتیوں اور لالٹینوں کی بکری بڑھ گئی تھی۔اتنی چمنیاں تو شاید تب بھی نہ بکتی رہی ہوں گی جب شہر میں بجلی تھی ہی نہیں۔بجلی اور لالٹین کے باہمی رشتے کی فلسفیانہ باریکیوں پر غور کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک پتھر ان کی چمنیوں کے ہار پر پڑا اور دو تین شیشے چھن چھن کرتے نیچے آ گرے۔وہ بھنا کے پلٹے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ چاروں لڑکوں کی پشت ان کی طرف تھی۔وہ کندھے سے کندھا جوڑے، گڈھے کے اندر جھانکنے اور بلی کے بچے کی قابل رحم حالت سے محظوظ ہونے میں مصروف تھے۔ پھر پتھر کہاں سے آیا؟ یوں تو گمان غالب تھا کہ انہیں لونڈوں نے مارا ہے اس لئے کہ پتھر ان کے پاس تھے اور حاجی بغلول پر پتھر چلانے کا معقول جواز بھی۔لیکن اتنی دور سے، ایسے سدھے ہوئے ہاتھ سے پتھر پھینک کر وہ اس بے نیازی کے ساتھ شانہ بشانہ صف بندی کر کے کھڑے ہو جائیں یہ حیرت نگیز تو تھا ہی، ساتھ ہی

حاجی بغلول کے دفاع کو کمزور بھی بناتا تھا۔ وہ کیسے کہیں کس بنا پر کہیں کہ پتھر ان لڑکوں نے مارا ہے۔ مونہہ کھولے وہ ادھر ادھر تاکنے لگے۔

دو ایک لوگوں نے ہمدردی جتائی۔ ایک نے کہا ''میاں کھڑے کیا ہو، سرک لو کسی نے تمہاری چمنیاں تاک لی ہیں۔ شاید وہ بھی کوئی دوکاندار ہے جو اپنی دوکان پر چمنیاں رکھنے کی سوچ رہا ہے۔ اس لئے تمہیں دہشت زدہ کرنے کی ٹھانی ہے۔''
ایک صلح پسند شخص نے کہا ''ارے میاں کیا دور کی کوڑی لا رہے ہو۔ شاید اوپر سے کسی عورت نے کوڑا اپھینکا ہوگا۔ بے دھیانی میں اس میں پتھر رہ گیا ہوگا۔ اتفاق سے وہ حاجی بغلول کی چمنیوں پر آن گرا۔ اب اتفاقات کی کون کہے...''

حاجی بغلول تاسف کے ساتھ اپنی چمنیوں کو گنتے اور نقصان کا تخمینہ لگاتے تیز تیز قدموں سے دوکان کی طرف نکل لئے۔ ان کے چوراہا پار کرتے ہی گڈھے کی طرف سے قہقہہ بلند ہوا۔ نوعمر گلوں سے نکلا کھنکتا ہوا قہقہہ۔

بلی کا بچہ اب کافی زور زور سے میاؤں میاؤں کر رہا تھا وہ پوری طرح تہہ میں گر چکا تھا۔ گہرائی سے گردن اٹھا کر دیکھتا اور پھر دبک جاتا۔ اس کے چہرے پر وہ معمولی خوف نہیں تھا جو اجنبی انجان ماحول یا اجنبی چہروں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر موت کی دہشت تھی۔

لڑکے برابر چلاّ رہے تھے جیسے وہ بلی کا بچہ نہیں تھا کوئی نوجوان عورت تھی جس پر زنا کا الزام لگا کر سنگسار کئے جانے کی سزا سنائی گئی تھی (قبل اس کے کہ الزام ثابت ہو سکے)۔

'بعضے لوگ اتنے بے رحم کیوں ہو جاتے ہیں؟' پاس سے گذرتے سرکاری ڈسپنسری کے لنگڑے کمپاؤنڈر نے سوچا۔ ان کی مجہول سی بیٹی سے جب برادری کا ایک نوجوان شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تو انہوں نے چین کی سانس لی تھی۔ انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ ہے جو ان کی نجات کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لنگڑے کمپاؤنڈر کے پاس جائداد کے نام پر ایک چھوٹا سا نیم پختہ مکان تھا جو انہوں نے باقی اولادوں میں سے کسی کو نہ دے کر اس لڑکی کے نام کر دیا تھا تا کہ

کوئی اسے نکال باہر نہ کر سکے اور ان کے مر جانے کے بعد اس کا ایک کمرہ بطور دوکان اٹھادیا جائے یا کسی اور طرح کرائے پر لگ جائے تا کہ بچی کی کفالت ہو سکے۔مکان محلے میں ایسی جگہ تھا جہاں چھوٹی موٹی دوکان بہ آسانی چل سکتی تھی۔چھوٹا سا قصبہ نما شہر بڑا شہر بننے کی راہ پر گامزن تھا اور نئی تعمیرات کے سلسلے نے اس طرح کے مکانوں کی قیمت میں اضافے کی قوی امید پیدا کر رکھی تھی۔

لنگڑے کمپاؤنڈر کی مجہول سی بیٹی کے عقلمند شوہر نے مکان کے کاغذات پر اس سے انگوٹھا لگوالیا، اور مکان اپنے نام کرالینے کے بعد علاج کے نام پر اسے ایک دماغی ہسپتال میں چھوڑ آیا جہاں وہ صرف مجہول سی نہ رہ کر باقاعدہ ذہنی مریض میں تبدیل ہوگئی۔اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔تب سے لنگڑے کمپاؤنڈر از حد ملول رہا کرتے تھے۔بات بات میں ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔اتنے ہی رقیق القلب ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ ایک جلی ہوئی بہو کی مرہم پٹی کرنی پڑی تو تین دن تک کھاٹ سے لگے پڑے رہے۔لوگوں نے اس پر کہا کہ لنگڑے کمپاؤنڈر تو خود ہی خاصے مجہول تھے (کہ آج کے دور میں دوسروں کے دکھ سے متاثر ہونے والا مجہول ہی کہلائے گا۔) بیٹی کو ذہنی فتور تو دراصل ورثے میں ملا ہے۔یہ سچ نہیں تھا لیکن جب کوئی بات زبان زد عام ہو جاتی ہے (یا بنادی جاتی ہے) تو بڑے سے بڑے جھوٹ بھی سچ مان لئے جاتے ہیں۔اب لنگڑے کمپاؤنڈر کو ہی لیجئے۔لوگوں نے ان کے دکھ سکھ، ان کا ہنر، ان کی بھلمنساہت، سب کو فراموش کر کے ان کے پیر کے لنگ کو چن لیا تھا اور ان کا اصل نام بھول گئے تھے۔اب انہیں لوگوں نے یہ سچ مان لیا تھا کہ لنگڑے کمپاؤنڈر خود اپنی بیٹی کے ذہنی خلل کے لئے ذمہ دار تھے۔انہوں نے کبھی اس کا علاج کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ان کا داماد نہایت بھلا آدمی تھا کہ ایک تو وہ بیوی کا علاج کرا رہا تھا اور دوسرے یہ کہ جہیز میں ملے مکان کے باہری حصے میں جو آسانی سے بطور کرایہ اٹھایا جا سکتا تھا، سسر کو رہنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔

اب لنگڑے کمپاؤنڈر پر جو بھی گذر رہی ہو فی الوقت تو بلی کے بچے کی دردناک

میاؤں میاؤں اوراس پر پتھر پھینکتے بچوں کو تعینات دیکھ کر لنگڑے کمپاؤنڈر کا دل بھر آیا۔وہ قریب آئے اور ذرا ڈپٹ کر بولے'' کیا کر رہے ہو تم لوگ؟اس غریب بلی کے بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ جاؤ بھاگو جا کے پڑھو لکھو۔ بھلے گھروں کے لڑکے ہو بھلے آدمی بنو۔کچھ دل میں رحم اور ہمدردی بھی رکھو۔''

لڑکوں نے اس سارے وعظ کو یوں سنا جیسے وہ کسی دیوانے کی بڑ سن رہے ہوں۔بڑی شان بے نیازی سے انہوں نے کندھے اچکائے اور ننھی بلی پر دو چار پتھر اور پھینکے۔

''ٹھہرو تو سہی!''لنگڑے کمپاؤنڈر کو ان کی بے نیازی میں اپنی صریح توہین نظر آئی اور اسکی وجہ سے تھوڑا غصہ آ گیا ''ٹھہرو تو سہی...'' انہوں نے دھمکانے والے انداز میں کہا۔

'' آج تمہارے ماں باپ سے شکایت نہ کی تو نام بدل دینا۔ارے تم انسان ہو کہ شیطان۔''لڑکے ہاہا کر کے ہنس پڑے۔

'' کیا سمجھ رہے ہو یہ نری دھمکی نہیں ہے۔''لڑکوں کے ہنسنے سے وہ مزید مشتعل ہوئے اور واقعی چل پڑے شکایت کرنے۔

لڑکے اغل بغل کے ہی تو تھے۔تھوڑا چلنے پر ان کا محلہ آ گیا۔ایک کے دادا حضرت باہر کھڑے داتون کر رہے تھے۔وہ دراصل سارے محلے کے دادا تھے۔ پرانے آدمی۔لیکن لنگڑے کمپاؤنڈر کی شکایت پر ناراض ہو گئے۔''ارے میاں ککڑی کے چور کی گردن مارنے جیسی بات کر رہے ہو تم۔اب لڑکے ایسی حرکتیں تو کرتے ہی رہتے ہیں۔اس بے بضاعت بلی کے بچے پر دو چار کنکریاں پھینک دیں تو تم یہاں دوڑے چلے آئے،شکایت کرنے۔''پوپلی آواز میں ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے بیچ سے تھوکا تو اس میں نیم کی کڑواہٹ کے ساتھ لنگڑے کمپاؤنڈر کی احمقانہ شکایت کی وجہ سے پیدا ہوئی تلخی بھی تھی۔

''مگر چچا وہ بلی کا بچہ۔آخر اس میں بھی جان تو ہے نہ۔پھر سب سے بڑی بات یہ ہے چچا کہ رحم دلی اور ہمدردی کی تعلیم تو ابھی سے ملنی چاہئے ورنہ بڑے ہو کر یہ کیا

بنیں گے؟''

''بلی کا بچہ تمہارا رشتے دار لگے ہے کیا؟ جاؤ جاؤ، کہاں جا رہے تھے؟ ڈسپنسری سے رٹائر ہو چکے ہو نا؟ چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ خبطی آدمی۔ لوگوں کو غلط سلط سوئی لگا دیتے۔ مرہم کی جگہ چونا تھوپ دیتے۔ ہونہہ چلے آرہے ہیں بلی کا بچہ۔ ارے جلوس نکلوا دو اس بلی کے بچے کے لئے۔ میٹنگیں بلوالو۔ بڑھاپا آیا تو اور سٹھیا گئے۔'' دادا تو جیسے ابل ہی پڑے۔

لنگڑے کمپاؤنڈر اپنے رقیق (اور اب مجروح بھی) قلب کو لئے لنگڑاتے لنگڑاتے دوبارہ ادھر سے گذرے تو بلی کے بچے پر ڈھیلوں کی آخری بوچھار پڑ رہی تھی۔ وہ کسی پھٹے پرانے، بھیگے کپڑے جیسا ہو گیا تھا۔ مڑا تڑا سا۔ مر جائے گا تو دنیا پر کون سی قیامت گذر جائے گی۔ انسان مر جائیں اور لاکھوں کی تعداد میں مر جائیں تو بھی نہ گزرے قیامت۔ روز خبریں پڑھ لو عراق کی۔

ہاتھ جھاڑ کے لڑکوں نے سوچا کہ اب اسکول چلنا چاہئے۔ مزا نہیں آرہا۔ نہ تو بلی کا بچہ میاؤں میاؤں کر رہا ہے اور نہ اپنے دفاع کے لئے ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ وہ وہاں سے چل پڑے۔ لنگڑے کمپاؤنڈر ان کے قریب پہنچے تو لڑکوں نے ان کی نقل میں کمر پر ہاتھ رکھے اور لنگڑا لنگڑا کے چلنا شروع کیا۔ ان کے چہرے بالکل سپاٹ تھے، ان پر ہنسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاں اسکول کے پھاٹک میں قدم رکھنے کے بعد وہ سب ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔ زندگی کا ایک اور دن بڑی دلچسپیوں کا حامل گذرا تھا۔

☆☆

چھوٹے چچا

گرمی کی دوپہر آنکھوں میں چبھنے والی دھوپ سے جگ مگ کر رہی تھی۔لُو کے بگولے سڑک پر چکراتے پھرتے تھے۔کئی دنوں سے چھوٹے چچا پوسٹ مین کی راہ دیکھ رہے تھے۔شاید تسنیم میاں کا خط آئے یا ان کے بال بچوں میں سے ہی کوئی لکھ دے۔یا شاید سیما کو خبر پہنچ گئی ہو اور اس نے خط لکھا ہو۔ڈاک کا وقت گذر جاتا تو وہ گالیوں کی بوچھار شروع کر دیتے۔کس کو فرصت ہے ان کے لئے۔سب نمک حرام ہیں،ذلیل کتے کہیں کے۔اپنے اپنے بال بچوں میں مگن۔اپنی دنیا میں مسرور و شادماں۔ہسپتال کے بستر پر پڑے پڑے خط لکھا۔کسی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

دور کہیں پوسٹ مین کی خاکی وردی چمکی۔وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئے مگر نکڑ والے گھر میں خط ڈال کر وہ پلٹ چکا تھا۔گلی میں داخل ہی نہیں ہوا کہ کچھ دیر اور آس بنی رہ جاتی۔انہوں نے گالیوں کی بوچھار تیز کر دی۔بے قصور پوسٹ مین بھی ان کی زد میں آ گیا۔کسی نہ کسی نے تو خط ضرور لکھا ہوگا۔تسنیم تو جنم کا کمینہ ہے مگر اس کے بچے اتنے برے نہیں۔اور سیما؟ وہ تو شاید خبر پا کر دوڑی چلی آئے۔ٹھیک ہے

آج سے وہ خط کا نہیں ٹرین کا انتظار کریں گے۔ ناسک سے کون کون سی گاڑیاں آتی ہیں اور کس وقت یاد ہی نہیں رہا تھا۔ جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ سائیکل اٹھائیں اور نکل جائیں اسٹیشن۔ یا کسی پبلک بوتھ سے فون کر کے معلوم کر لیں۔ انتظار... زندگی ایک طویل انتظار ہی تو تھی۔

بھوک ساری تلخیوں پر حاوی ہوگئی۔ کمزور جسم کو گھسیٹ کر وہ اٹھے اور اسٹوو سے پانی ملے دودھ کی پتیلی سرکائی۔ پولی تھین کے لفافے میں ڈبل روٹی کے دو سلائس پڑے تھے، وہ مسل کے دودھ میں ملائے۔ آمیزہ کچھ گاڑھا تھا اس لئے اس میں ذرا سا پانی ڈالا اور اس بے مزہ مکسچر کو ذرا ذرا سا کر کے بڑی احتیاط کے ساتھ حلق کے نیچے اتارنے لگے۔ کوئی بیس روز قبل ان کے گلے کا ایک بڑا آپریشن ہوا تھا۔ غذا کی نلی کا ایک کافی بڑا حصہ کاٹ کر نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک مصنوعی پائپ جوڑ دیا گیا تھا۔ انہیں صرف پتلی غذائیں کھانی تھیں جو آسانی سے گلے سے اتر سکیں۔ کھاتے ہوئے ڈر بھی لگتا تھا۔ صرف دو بار کچھ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ صبح، ایک مرتبہ شام۔ کبھی کبھی درمیان میں بڑی بھوک لگ آتی تھی۔ آج نہیں رہا گیا تھا اس لئے اس وقت کچھ کھا لیا۔ پھر کسی طرح مر کھپ کر برتن دھوئے اور بستر میں گٹھری بن کر پڑ رہے۔ بھوکے پیٹ میں کچھ پڑا تو نیند آنے لگی۔ اس وقت بغل والے شرما جی کی باتونی بیوی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ ان کی دستک پہچانتے تھے۔ جھنجھلا کر اٹھے۔ اس وقت کیوں آئی ہے یہ سمن؟ ضرور کوئی کام ہوگا۔ گیس ختم ہوگئی ہے، اسٹوو دے دیجئے، ایک پندرہ پیسے کا اسٹامپ تو نہیں ہوگا آپ کے پاس؟ مطلب پرست، خود غرض۔ دس دن گذر گئے کچھ رسالے لے گئی تھی، کہہ رہی تھی دو دن میں لوٹا دے گی۔ آج تک نہیں لوٹائے۔ ضرور نیت خراب ہے۔ کباڑی کے ہاتھ بیچ دیے ہونگے۔ اٹھتے اٹھتے انہوں نے سمن شرما کے لئے کئی اسم صفت استعمال کر ڈالے اور ناگواری کے شدید تاثر کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہ اندر آئیں اور بے چین پتلیوں والی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ کر پلو کے نیچے چھپا ہوا ہاتھ باہر نکالا۔

''آپ کے رسالے واپس کرنے آئی ہوں چاچا اور یہ پوچھنے کہ آپ کیسے ہیں؟''

چھوٹے چچا شرمندہ ہو گئے۔ ''ابھی زندہ ہوں'' انہوں نے رسان سے کہا۔

''زندہ تو آپ رہیں گے چاچا۔ آپ تو ہمارے محلے کی رونق ہیں، کیا کھایا آپ نے؟ ڈبل روٹی؟ دودھ بہت سا ملایا تھا کہ نہیں؟ پانی ملا لیا ہوگا؟ پانی مت ملایا کیجئے چاچا۔ بڑھاپے کا بدن ہے، پھر آپریشن ہوا ہے، گے دن ہی ہوئے۔'' وہ ایک سانس میں لگاتار بول گئیں۔

چچا پھر بھڑک گئے۔ پانی نہ ملاؤں تو دودھ کا دام کیا تیرا خصم دے گا۔ دل ہی دل میں انہوں نے کہا لیکن بظاہر خاموش رہے۔ سمن شرما کا لکچر جاری تھا

''لے، اب بھاگو یہاں سے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' تنگ آ کر چچا کو کہنا پڑا۔

''ہاں چاچا چلوں گی۔'' انہوں نے برا مانے بغیر کہا۔ ''نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ آپ کے بھائی کا کوئی خط آیا؟ وہ بھتیجا آیا آپ کا؟ آتا تو مجھے ضرور پتہ چل جاتا۔ کلجگ ہے چاچا، گھور کلجگ۔ کوئی کسی کا نہیں۔ کوئی ضرورت ہو تو پوچھ لیجئے گا۔ شرما جی بمبئی گئے ہوئے ہیں لیکن میں تو ہوں۔ بھگوان اکیلا رکھے پر لاچار نہ بنائے۔ پرائے پوت کہیں کسی کی ہوئے ہیں؟'' وہ دھڑ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

چھوٹے چچا کی نیند غائب ہو گئی۔ وہیں اکڑوں بیٹھے ہانپتے کانپتے گالیاں بکنے لگے۔ پرائے پوت؟ یہ ان کی دکھتی رگ تھی۔ لیکن کیا محض پیدا کرنے سے محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے؟ ذرا دور پر ماڈل ہاؤس میں جو سالک صاحب رہتے ہیں ان کے بیٹے نے ان پر مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ محبت، رشتے، ناطے، یہ سب کتنے کھوکھلے الفاظ ہیں۔ کتنے جھوٹے۔ تسنیم میاں کی پہلی بچی سیما، چچا کی کمزوری تھی۔ اس کے پیدا ہونے سے قبل گھر بھوتوں کا ڈیرہ معلوم ہوتا تھا۔ بڑے سے سونے آنگن میں اماں پرچھائیں کی طرح چلتیں۔ تسنیم میاں کی دلہن بڑی کم سخن، سہمی سکڑی سی لڑکی تھی۔ اماں کے تیز مزاج کے آگے اور بھی سکڑ سمٹ گئی تھی۔ نہ ہنسنا نہ بولنا۔ ابا کے مرنے کے بعد سارا اثاثہ عزیزوں، رشتہ داروں نے لوٹ کھایا تھا۔ جب تک تینوں بھائی بڑے ہوئے، اماں کے سارے زیور اور جمع پونجی خرچ ہو چکے تھے۔ تینوں بھائی خاموش خاموش سے رہتے۔ فکر فردا میں گم۔ اپنی اپنی سوچوں، کے اسیر۔ سیما پیدا

ہوئی تو گھر میں گھنگھر و بج اٹھے۔ تسنیم میاں تو چور سے بن گئے۔ یہ ایک اور مونہہ آ گیا کھلانے کو۔ لیکن چھوٹے چچا جو اس وقت چھوٹے چچا نہیں، وسیم میاں کہلاتے تھے، نہال ہوا ٹھے۔ بچی ذرا بھی روتی تو بے چین ہو جاتے۔ بھاوج کے کمرے کے سامنے سے بار بار گذرتے۔ کیوں روئی بٹیا؟ گودی اٹھاؤ دلہن۔ نہیں تو لاؤ مجھے دے دو۔ وہ ننھی سی مکوڑے جیسی بچی کو کندھے سے لگا کر گھر باہر ایک کر دیتے۔ وہ چار برس کی تھی جب تسنیم میاں بیوی بچوں کو لے کر نئی ملازمت پر الہٰ آباد چلے گئے تھے۔ چلتے وقت سیما نے بڑا ہنگامہ کیا تھا اور الہٰ آباد پہنچنے کے بعد تو وہ ہڑک ہی گئی تھی۔ ایسی بیمار پڑی کہ تار دے کر چھوٹے چچا کو بلوانا پڑا۔ گالیاں بکتے بکتے وہ مسکرانے لگے۔ کڑواہٹ میں مٹھاس کی ہلکی سی لکیر دوڑ گئی۔ انہوں نے ٹین کا بکس کھولا۔ ننھی سیما کی تصویر نکالی جو اب زرد پڑ چکی تھی۔ اسی لفافے میں اس کی بچی کی بھی تصویر تھی۔ نئی تر و تازہ اور شاداب۔ کتنی تمنا تھی سیما کے بچوں کو کھلانے کی۔ وہ دونوں تصویریں ہاتھوں میں لئے بت بنے بیٹھے رہے حتیٰ کے ان کے گھٹنے سن ہو گئے۔ یکا یک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ باہر گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا سن سن کر رہا تھا۔

سناٹے کو چیرتی ہوئی اماں کی سرگوشی اچانک سارے کمرے میں پھیل گئی۔

دخل در معقولات ان کی عادت جو ٹھہری۔ مرنے کے بعد بھی وہ کسی نہ کسی کونے کھدرے سے جھانکتیں اور بقول شخصے مُن سے کچھ بول جاتیں۔

''...ارے کم نصیب شادی کیوں نہیں کی۔ چھوٹے اور بڑے دونوں بال بچے والے ہوئے۔''

اس وقت بھی انہوں نے چالیس برس پہلے کہا ہوا جملہ دہرایا اور غائب ہو گئیں۔

چھوٹے چچا نے آنسو پوچھ لئے اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔

دراصل چھوٹے چچا کی شادی کی ساری اڑچن ہی یہی تھی کہ ''باقی دو'' کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ تسنیم میاں تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن سب سے پہلے وہی پکڑے گئے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے وہی اپنے پیروں پر کھڑے

ہوئے تھے۔نسیم میاں اور چھوٹے چچا، دونوں بیکار تھے۔گھر کا خرچ لشٹم پشٹم چل رہا تھا۔مگر اماں کو یکا یک بہو کا ارمان گدگدانے لگا۔(اور گھر گرہستی میں ہاتھ بٹانے والی ایک محنتی بے تنخواہ ملازمہ کا بھی)تسنیم میاں نے بہت اونچ نیچ سمجھائی مگر وہ نہ مانیں اور ایک بے چاری شامت کی ماری ان کے آنگن میں بہو بن کر اتر آئی۔اب سے چالیس برس پہلے فیملی پلاننگ والے مزے سے سوتے تھے کہ کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔گھر بچوں سے بھر اٹھا۔تسنیم میاں کی حالت ہمیشہ خستہ رہی۔نسیم میاں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔نوکری لگتے ہی اماں نے ان کے پیروں میں بھی بیڑیاں ڈال دیں مگر تین سال کے اندر اندر وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔انہیں گٹھیا کی شکایت ہو گئی تھی اور آنکھوں میں یکا یک کوئی معذور کن مرض اتر آیا تھا۔اس درمیان ان کے بھی دو بچے ہو گئے تھے۔

کافی تگ و دو کے بعد چھوٹے چچا کو بھی نوکری مل گئی تھی اور اب اماں ان کے لئے گھر گھر لڑکی تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔تبھی چھوٹے چچا نے انتہائی سخت اور درشت لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا''میں شادی نہیں کروں گا۔اماں فضول وقت اور انرجی برباد نہ کریں۔''

وسیم میاں یعنی چھوٹے چچا کو بچوں سے بہت محبت تھی۔بڑے بھائی کے بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔تسنیم تو خود چیونٹیوں بھرا کباب تھے۔وہ کیا مدد کرتے۔''اگر میری بھی شادی ہو گئی تو یہ غریب کیا کریں گے؟''بڑے بھیا کی آنکھیں کمزور ضرور ہو گئی تھیں لیکن کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو کر ہی سکتے تھے۔کوئی دوکان یا ہلکا پھلکا روزگار۔وہ کچھ کرنے لگیں تو دیکھا جائے گا۔بڑے صبر کے ساتھ انہوں نے اچھے دنوں کا انتظار کیا جو کبھی نہیں آئے۔بڑی مشقت سے اوور ٹائم کر کے،ضروریات کو قطع کر کے نسیم میاں کا مہنگا علاج کرایا۔وہ کافی ٹھیک بھی ہو گئے لیکن انہیں مفت خوری کی چاٹ لگ گئی تھی۔شطرنج کھیلتے اور جاسوسی ناول پڑھتے۔ان دونوں سے کچھ وقت بچتا تو کھری کھاٹ کے بان گھتے۔سارے حالات سے آنکھیں چرا کے اماں چھوٹے چچا کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔''ارے بیاہ کیوں نہیں کرتا؟نسیم کو نکما تو تو

ہی بنا رہا ہے۔'' چھوٹے چچا ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔اس درمیان اماں کے اصرار اور بیوی کی کہا سنی پر نسیم میاں نے کئی چھوٹے موٹے کاموں کو ہاتھ لگایا لیکن ہر مرتبہ چار چھ ماہ کے بعد گھر آ کر بیٹھ رہے۔اللہ کے فضل سے بیوی شوقین مزاج اور خراچ ملی تھیں۔

نرم مزاج، محبت بھرے چھوٹے چچا غصہ ور، شکی اور چڑچڑے ہوتے چلے گئے۔ ایک دن اماں نے فتویٰ دیا۔''معلوم ہوتا ہے نسیم کی دلہن کا جادو چل گیا ہے، اسی لئے شادی نہیں کرتا۔ پوری جادوگرنی ہے۔میرے ایک بیٹے پر قبضہ کر کے دل نہیں بھرا تھا....''

چھوٹے چچا صدمے سے پتھر بن گئے۔ یہ الزام ناقابل برداشت تھا۔ماں کی مورت جو پہلے بہت اونچے ستونوں پر ایستادہ تھی، نیچے گری اور چکنا چور ہوگئی۔ پہلے اماں تسنیم میاں کے یہاں رہنے کو جاتیں تو چھوٹے چچا دوسرے تیسرے ہفتے جاکے واپس لے آتے۔اسی بہانے سیما سے مل آتے۔وہ ہمیشہ ان کی چہیتی رہی۔اس کی جگہ انہوں نے کسی کو نہیں دی تھی۔لیکن اس بار اماں گئیں تو چھوٹے چچا نے لکھ بھیجا کہ اچھا ہے وہ وہیں رہیں۔تسنیم میاں کی دلہن زیادہ خدمت گذار اور کم سخن ہیں۔ یہاں روز بڑی بہو سے تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے۔اماں اپنے فتوے پر مزید ایمان لے آئیں اور چھوٹے چچا کا دل مزید پتھر ہوتا چلا گیا۔

اماں پہلے صرف بہو کو برا بھلا کہتی تھیں بعد میں چھوٹے چچا کو بھی کوسنے لگیں۔''اپنا سکہ کھوٹا تو پرائی لڑکی کو کیوں الزام دوں۔ناخلف، مردود، کم بخت۔اس کو کیا لڑکیوں کی کمی تھی۔کماؤ پوت دیکھنے سننے میں اچھا۔'' چھوٹے چچا پابندی سے اماں کے لئے خرچ کے روپے اور تحفے تحائف بھیجتے رہے لیکن مریں تو مونہہ دیکھنے نہیں گئے۔دفتر سے واپس آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں گھس جاتے اور نہ جانے کس سے باتیں کرتے رہے۔اماں کے انتقال کے بعد مزید گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اکثر صبح کو اٹھتے تو آنکھیں سرخ ہوا کرتی تھیں۔بچوں تک سے بات نہ کرتے۔

تسنیم میاں نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے بڑے بھیا کے لئے گورکھپور میں ایک

چھوٹی موٹی پرائیوٹ نوکری ڈھونڈی۔ وہ مع اپنے کنبے کے گورکھپور ہجرت کر گئے۔
چھوٹے چچا کے چڑ چڑے مزاج، ان کی کم سخنی اور گوشہ نشینی سے انہیں بھی وحشت ہونے لگی تھی اور ان کی بیوی کو بھی نگوڑے ناٹھے دیور کی خدمت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چھوٹے چچا اب بالکل تنہا تھے۔ تنہائی میں خود سے باتیں کرنے کی عادت بڑھ گئی تھی۔ گالیاں بھی بکنے لگے۔ ساری دنیا انہیں دشمن نظر آتی۔ ڈھنڈار گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ سیما ان کی لاڈلی سہی، بڑے بھیا کے بچے بھی تو آخر بھتیجے بھتیجیاں ہی تھے۔

بڑے بھیا حسب عادت نئی نوکری بھی نہیں سنبھال سکے۔ لیکن اب وہ واپس لکھنو نہیں آئے۔ گورکھپور میں ہی رہ پڑے۔ چھوٹے چچا نے نخاس والا بڑا مکان چھوڑ دیا۔ گنّے والی گلی میں ایک مکان کا چھوٹا سا حصہ لے کر رہنے لگے۔ سارا انگڑ کھنگڑ گورکھپور بھجوا دیا۔ وہ اب زندگی سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ شادی بیاہ کی عمر مدت ہوئی کہ گذر چکی تھی۔ انہیں دوسروں کا بوجھ ڈھوتے رہنا تھا۔ تسنیم میاں نا قابل اصلاح تھے اور چھوٹے چچا بھی۔ وہ بڑے بھائی اور ان کے بچوں کو بھوکوں مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے لئے یہ تصور ہی نا قابل برداشت تھا۔

''بڑے بھیا نے چھوٹے بھیا کی زندگی برباد کر دی۔'' تسنیم میاں کسی عزیز کی شادی میں لکھنو آئے ہوئے تھے۔ کسی کے سامنے کہہ بیٹھے۔ بات چھوٹے چچا تک پہنچ گئی۔ ''اس حرامزادے تسنیم کے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے۔ خود تو کوئی مدد کر نہیں سکتا۔ جورو کا غلام۔ مجھے بھی ورغلانا چاہتا ہے۔''

ایک خط میں پچیس تیس گالیاں لکھ کر تسنیم میاں کو پوسٹ کر دیں۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ یونہی کون سا ربط رہ گیا تھا۔ نوکری ایسی تھی کہ شہروں شہروں مارے پھرنا پڑتا تھا۔ بس گاہے بگاہے بھائی کو خط لکھ دیا کرتے تھے۔ اب دل میں گرہ پڑ گئی۔ سادھو سنتوں نے کہا ہے کہ مایا جال خدا اور بندے کے درمیان حائل ہے لیکن خدا سے بھی پہلے اس کی چادر بندوں اور بندوں کے درمیان تن جاتی ہے۔

''اپنے کئے کا علاج نہیں بیٹا۔ تمہاری وجہ سے ہی نسیم نے ہاتھ پیر ڈال دئے ہیں۔ تم ذرا ہاتھ کھینچ کر دیکھو۔ وہ ضرور کچھ کرنے لگے گا۔'' اماں نے ایک بار اپنی

ٹوٹی پھوٹی تحریر میں لکھ بھیجا تھا۔ان کی زبان جیسی بھی رہی ہو لیکن بیٹے کے لئے وہ ہمیشہ تڑپتی رہیں۔آخر وقت میں انہیں کا نام ان کی زبان پر تھا۔

اماں ...کہاں ہیں اماں ...؟ گھٹنوں سے سر اٹھا کر چھوٹے چچا نے خلا میں دیکھا اور آنکھیں پٹپٹائیں۔ایک بار واقعی آ جائیں تو پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں۔ مرتے وقت مجھے دیکھنا چاہتی تھیں۔وہ ایک بار پھر رو پڑے۔مالک مکان کی بیوی نے کھڑکی سے جھانکا اور خاموشی سے دوسری طرف چلی گئیں۔

''چھوٹے چچا...... چھوٹے چچا'' کسی نے مانوس آواز میں پکارا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

کون آیا جب ساری آس ٹوٹ چکی تھی۔ایک خط کی بھی!

ہاتھ میں چھوٹا سا بریف کیس لئے تسنیم میاں کا لڑکا رفعت کھڑا ہوا تھا۔''تم؟ تم کہاں سے آ گئے؟'' انہوں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔رفعت کچھ بوکھلا سا گیا۔چچا کا لہجہ تیزاب میں بھیگا ہوا تھا۔

''چھوٹے چچا' بہت دنوں سے آپ کی خیریت نہیں ملی تھی۔ہم لوگوں نے آپ کے خط کا بڑا انتظار کیا۔پھر اماں نے کہا کہ تم خود جا کر دیکھ آؤ۔کچھ دن پہلے آپ نے لکھا تھا نا کہ گلے میں مسلسل تکلیف رہتی ہے۔''

''جھوٹے کی اولاد...'' وہ بپھر گئے۔رفعت سر جھکا کر بیٹھ گیا۔غصے اور اہانت کے احساس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''میں تمہیں خوب جانتا ہوں اور تمہاری چڑیل اماں کو بھی۔''

''چھوٹے چچا...'' رفعت کی آواز میں احتجاج تھا۔

''مر گئے چھوٹے چچا بڑے چچا سب۔چلے جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' وہ پھنکارے۔''کہتا ہے خط نہیں ملا۔میں نے ہسپتال میں لیٹے لیٹے خط لکھا۔نرس کی خوشامد کر کے اسے پوسٹ کرایا۔''

''ہسپتال؟ آپ...آپ...؟'' رفعت گھبرا گیا۔

''ہاں اور کروا ایکٹنگ۔جیسے کچھ معلوم نہیں۔''

''قسم خدا کی چھوٹے چچا۔ حلف اٹھوا لیجئے۔ یہ خدا مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' رفعت روہانسا ہو گیا۔

ان کی آواز میں اب بھی بے یقینی تھی لیکن وہ کچھ قائل بھی ہو گئے تھے۔ اب لڑکا جھوٹی قسم تو نہ کھائے گا۔ انہوں نے گلے میں بندھا رومال ہٹا کر آپریشن کا نشان دکھایا۔ پوری روداد سنائی۔ ''اب کی جاڑوں میں موتیابند کا آپریشن ہونا تھا۔ یہ گلے کی مصیبت درمیان میں لگ گئی۔ خیر اب زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ قبر میں آنکھیں کھلیں گی۔ یہاں کون رونے والا بیٹھا ہے۔ بس ایک بڑے بھیا اور ان کے بچوں کی فکر ہے۔'' انہوں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔''

رفعت ان کی صلواتیں بھول گیا۔ یہ خون کے رشتے! بعض اوقات اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔

''چھوٹے چچا آپ گھر چلئے۔'' اس کی آواز بھاری تھی۔

''گھر؟ کس کے گھر؟ اس بدذات تسنیم کے گھر جس نے کبھی نہیں پوچھا یا ان فقطوں کے گھر جو میری ہی کمائی پر پل رہے ہیں؟''

''پہلے تو ابا نے پوچھا تھا چچا۔ آپ ہی راضی نہیں ہوئے۔ رٹائر ہوئے بھی چار پانچ برس ہو گئے۔ سیما آپا نے کتنی ضد کی۔''

سیما اپنی گھر گرہستی، شوہر اور بچوں میں گم۔ اسے اب چھوٹے چچا کی یاد کبھی کبھار ہی آتی ہو گی۔ کسی خالی لمحے میں۔ اور خالی لمحات بھرے پرے گھر کی بہو کے پاس کم ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صراحی سے پانی انڈیلا۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ آنکھیں پوچھیں۔ پھر کمزور ہاتھوں سے چائے کی کیتلی ڈھونڈنے لگے۔

''چائے بناؤں تمہارے لئے؟''

رفعت نے ان کے شانے پکڑ کر بٹھا دیا۔ ''خدا کے لئے چھوٹے چچا اتنا بھی گنہگار مت کیجئے۔''

''اچھا تو سامنے دوکان ہے وہاں پی آؤ۔ اسٹیشن سے آرہے ہو۔ تھکے ہوئے

ہو۔ ناشتہ بھی کر لینا۔'' انہوں نے پانچ کا ایک نوٹ رفعت کے حوالے کیا۔ رفعت نے اب کوئی احتجاج نہیں کیا وہ ان کے مزاج سے واقف تھا۔ سیما کی شادی پر وہ پانچ سو روپے کا چک دے رہے تھے۔ اس وقت وہ رٹائر ہو چکے تھے۔ پنشن پوری کی پوری بڑے بھائی کو بھیج دیتے تھے اور خود ہر ماہ پراویڈنٹ فنڈ سے ایک قلیل سی رقم اپنے لئے نکالا کرتے تھے۔ انتہائی عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لئے سیما نے کہا '' چھوٹے چچا آپ بہت کچھ دے چکے۔ اب صرف دعا دیجئے کہ میں خوش رہوں۔'' چچا بھڑک گئے۔ ایک جھٹکے سے چک جیب میں ڈال لیا۔'' اب یہ نوبت آ گئی کہ تو میری تنگ دستی پر ترس کھائے۔'' سیما نے بہت سمجھایا پھر بعد میں یہاں تک کہا کہ اچھا لایئے دے دیجئے۔ مگر وہ نہیں مانے۔ پھر سیما کے یہاں پہلا بچہ ہوا تو وہ رقم اس کے نام بھیج دی۔ پھولے نہیں سماتے تھے۔ سارا شکوہ دور ہو گیا۔ سیما نے آنسو بھری آنکھوں سے روپے رکھ لئے۔ ان کے بدلے میں کچھ دینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دینے والے کے اجداد کو قبر سے گھسیٹ لاتے۔ انہوں نے ساری زندگی دوسروں کو دیا ہی تھا۔ کسی کے ایک پیسے کے احسان کے روادار نہیں تھے۔ ان کے اس رویئے میں انا کے ساتھ وہ ساری تلخیاں بھی شامل تھیں جو وہ زندگی سے پاتے رہے تھے۔

رفعت چائے پی کر آ گیا۔'' چھوٹے چچا...'' اس نے ڈرتے ڈرتے بات دوہرائی۔'' میں دراصل آپ کو لینے آیا ہوں۔ آپ کیسے خود پکا کر کھایئے گا۔ کیسے تنہائی جھیلئے گا... ان آخری لمحات میں...'' آخر کے چار الفاظ اس کی زبان پر آتے آتے رک گئے۔

خلاف توقع اب کی انہوں نے گالیاں نہیں دیں۔ رسان سے بولے'' گلے میں بجلی کی سنکائی کی جاتی ہے۔ اس کا انتظام تمہارے گورکھپور میں نہیں ہے۔ کورس پورا ہو جائے اور ڈاکٹر اطمینان دلا دے تو آؤں گا۔ سیما کو لکھ دینا۔ ایک بار اس کو دیکھنے کی خواہش باقی ہے۔ اب مجھ سے خود نہیں لکھا جاتا۔ بڑی مشکل سے ہسپتال سے لکھا تھا کہ تم چلے آؤ۔ ڈاکٹر فوری آپریشن بتاتے ہیں۔''

'' بہ خدا چھوٹے چچا۔ مجھے کوئی خط نہیں ملا۔''

نہ ملا ہوگا۔ وہ رکھائی سے بولے۔ ''ڈاک کا کیا بھروسہ۔ آج کل کوئی حرام خور کام نہیں کر رہا۔ سب...'' انہوں نے ایک واہیات کریہہ الصوت لفظ ڈاک خانے والوں کے لئے استعمال کیا۔ رفعت نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

صبح کی گاڑی سے رفعت واپس ہوگیا اس کے بی کام فائنل کے امتحان سر پر تھے۔ چھوٹے چچا نے وعدہ کیا تھا کہ سنکائی کا کورس مکمل ہو جائے گا تو تار دے کر اسے بلوا لیں گے اور ساتھ چلیں گے۔ تب تک سیما بھی آ جائے گی۔

نمکین دلیہ خاصہ مزیدار تھا۔ چھوٹے چچا نے دوسرا چمچ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ گلی میں پھل والے کی آواز سنائی دی۔ خدا بھلا کرے سمن شرما کا۔ بک بک تو بہت کرتی ہے لیکن ہر دوسرے تیسرے روز کچھ نہ کچھ پکا کر دے جاتی ہے۔ آج اس کے بچوں کے لئے کچھ پھل ضرور لونگا۔ انہوں نے سوچا۔ پھل والے کی آواز دور جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہڑبڑا کر پکارا۔ ''پھل والے ...او میاں پھل والے ... موںہہ میں کچھ دلیا باقی تھا۔ اچھو لگ گیا۔ لوٹنے لگے۔ چند منٹوں میں خون کی بڑی سی قئے ہوئی۔ اچھو لگنے سے گلے میں لگائے گئے مصنوعی پائپ کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ مالک مکان سے چھوٹے چچا نے جھگڑا کر رکھا تھا لیکن کراہیں سن کران کی بیوی بھاگتی ہوئی آئیں۔ حالت دیکھ کر جلدی سے ٹیکسی منگوائی، محلے کے ایک لڑکے کو ساتھ لیا۔ مالک مکان ہادی صاحب اور بغل والے شرما جی دونوں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ کنگ جارج میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں چھوٹے چچا کچھ دیر یونہی پڑے رہے۔ ڈاکٹر جانے کیا صلاح کر رہے تھے۔ چچا نے اشارے سے ساتھ آئے لڑکے کو پاس بلایا۔ گھرگھراتی ہوئی آواز میں بولے ''بیٹا ایک کام کرو۔ میرے بکس میں پاس بک ہے، کپڑوں کے نیچے، بائیں طرف کو۔ وہ بھاگ کر لے آؤ۔ آمد و رفت کا کرایہ میں دونگا۔ ٹیکسی لے لینا جلدی کرو۔'' نیک دل نوجوان الٹے پاؤں واپس ہوگیا۔

تسنیم میاں فیصلہ کر چکے تھے کہ لکھنو نہیں جانا ہے۔ کون جائے۔ دیکھتے ہی چھوٹے بھیا گالیوں کی بوچھار کر دینگے۔ وہ جو لکھنو کے پروردہ تھے، کبھی کوئی رکیک لفظ زبان سے ادا کرنا گوارا نہیں تھا، وہ جو دوسروں کی زبان درست کیا کرتے تھے اب سید ھے ماں بہن پر اتر آتے تھے۔ زہر نیل کنٹھ نے بھی پیا تھا لیکن وہ دیوتا تھے ہضم کر گئے۔ چھوٹے چچا انسان تھے، ہضم نہیں کر سکے۔ وقت بے وقت اگلتے رہتے تھے۔ جس پر چھینٹے پڑتے وہ جل جاتا۔ رفعت کا خط ملا تو تسنیم میاں پٹنہ میں تھے اور دفتر کے کام سے امرتسر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

کچھ اور ڈاکٹروں اور نرسوں کا جھنڈ یکا یک کمرے میں در آیا۔ چھوٹے چچا نے اپنی دھندلاتی آنکھیں کھولیں، دور کہیں ان سب کے پیچھے اماں کھڑی تھیں۔ انہوں نے بے جان ہاتھوں سے آنکھوں پر چھجا بنایا۔ ذرا غور سے دیکھا 'سیما آئی ہے کیا؟ سیما کا ہیولیٰ نظر ضرور آیا لیکن پھر دھند میں مدغم ہو گیا۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ نرس انہیں انجکشن دے رہی تھی۔

''پاس بک... پاس بک...'' انہوں نے دھیرے سے دہرایا

لڑکا ان کی پاس بک لے آیا تھا۔ اس میں کئی سادہ فارم رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے چچا نے ایک فارم نکلوایا۔ اس کی خانہ پری کروائی۔ ''خدا کا شکر، میں ابھی زندہ ہوں،'' انہوں نے کہا'' میرے بٹوے میں بہت کم پیسے تھے۔ اب یہ رقم نکلوا کر شرما کی بیوی کے حوالے کر دینا۔ کفن دفن میں کام آئے گی۔ اور خدا تمہارا بھلا کرے جو اخراجات تمہارے ہوئے ہوں وہ تم لے لینا۔''

ڈاکٹر دوسرے آپریشن کی تیاری کر رہے تھے۔ ''کیوں تکلیف کرتے ہو میاں۔'' انہوں نے ڈاکٹروں کی طرف دیکھا اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ پھر بہ دقت تمام پیسے نکالنے والے فارم پر دستخط کئے اور کانٹوں کی سیج پر آنکھیں بند کر لیں۔

دھڑ ادھڑ دھڑ ادھڑ..... تسنیم میاں کو لئے ہوئے هاوڑہ امرتسر میل لکھنو سے گذر گئی۔

تازہ قبروں کا وہ چھوٹا سا قطعہ سب سے الگ تھلگ تھا اور دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ حال ہی میں قبرستان اس طرف کو پھیلنا شروع ہوا تھا اس لئے درخت ابھی لگائے نہیں جا سکے تھے۔ ساری کی ساری قبریں کچی تھیں۔ لکھنو والے بڑے ہی ستم ظریف ہیں۔ مرُدوں کو بسایا ہے عیش باغ میں۔ کتنا خوبصورت نام ہے عیش باغ۔ اور کس قدر مناسب۔ سارے دکھ ختم ہوئے۔ وہ جو گوشت پوست تھا احساسات سے جھنجھنا اٹھنے والا... وہ جو دماغ تھا سوچ سوچ کر پاگل ہونے والا، وہ جو دل تھا سارے فساد کی جڑ... ارمانوں کے ہجوم سے، درد کی شدت سے ہر وقت پھٹ پڑنے کو تیار۔ یہ سب مٹی میں مل کر اپنے انجام کو پہنچے۔ ہر جذبے ہر احساس، ہر مسرت، ہر آگہی سے بے نیاز ہڈیاں بچی ہیں وہ عیش کر رہی ہیں۔ دائمی عیش۔

سیما نے چھوٹے چچا کے مالک مکان، ہادی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اور چہرہ تاثرات سے عاری۔ وہ مجاور سے مخاطب تھے۔ کیوں میاں وہ جو پچھلے جمعہ کو ایک لا... ایک صاحب لائے گئے تھے... وہ... اتنے ہی دنوں میں چار پانچ قبریں اور اگ آئی ہیں ورنہ اس طرف کو ان کی قبر تنہا تھی۔ اب پہچاننے میں مشکل ہو رہی ہے۔'' مجاور نے پھاوڑے سے اشارہ کیا... یہ رہے...

سیما کے دل میں شک گھر کر گیا۔ نہ کوئی نام نہ نشان۔ پتہ نہیں اس میں وہ ہیں بھی یا نہیں۔ ہادی صاحب انتہائی انہماک سے فاتحہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ سیما نے سر ڈھک لیا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ ''چھوٹے چچا، پیارے چھوٹے چچا۔ بد مزاج اکل کھرے، فی منٹ پچاس کی رفتار سے ساری دنیا کو گالیاں دینے والے، معصوم مظلوم، کم نصیب چھوٹے چچا میرا انتظار تو کر لیا ہوتا'' فاتحہ کی جگہ اس کے ذہن نے گردان کی — آنسو پھانسی کا پھندہ بن کر گلے سے لپٹ گئے۔

فاتحہ کے بعد ہادی صاحب نے سر اوپر اٹھا لیا تھا لیکن سیما وہیں تپتی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔ پاس کی تینوں چاروں قبروں کو اس نے بہت پیار سے چھوا اور ان سے ذرا ذرا سی مٹی لے کر آنکھوں سے لگائی۔ نہ جانے ان میں سے کن

میں چھوٹے چچا دفن ہیں۔ ویسے اب یہ معلوم ہو جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ یہ سارے فاتحہ درود، ہار پھول، چراغاں، یہ سب زندوں کی تسلی کی باتیں ہیں۔ وجود سے عدم میں تبدیل ہونے کے بعد سب کچھ منفی ہو جاتا ہے۔

''چھوٹے چچا، چھوٹے چچا۔ میں آئی ہوں۔ کیا آپ کچھ دیکھ سکتے ہیں؟ سن سکتے ہیں یا آپ مٹی میں دھیرے دھیرے گھلنے والے گوشت پوست کا ایک ڈھیر ہیں؟ ہڈیوں کا انبار ہیں؟'' سیما کے پیٹ میں ایک گولہ سا اٹھا اور سیدھا حلق میں جا کر اٹک گیا۔

واپسی میں اس نے چھوٹے چچا کے مالک مکان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ان تین افراد میں سے تھے جنہوں نے چچا کو آخری منزل تک پہنچایا تھا۔ سیما کے لئے وہ لگ بھگ اجنبی تھے لیکن قبر کی نشاندھی وہی کر سکتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ چھوٹے چچا نے اسپتال سے رفعت کو جو پوسٹ کارڈ لکھا تھا وہ ان کے مرنے کے دوسرے دن واپس لوٹ آیا تھا۔ کچھ تو وہ مخبوط الحواس ہو گئے تھے اور کچھ موتیا کی وجہ سے دکھائی کم دیتا تھا۔ رفعت کا پتہ انہوں نے صحیح نہیں لکھا تھا۔ ہاں کارڈ کی پشت کے نصف خالی حصے میں انہوں نے حسب عادت اپنا مکمل پتہ لکھا تھا۔ اس لئے کارڈ واپس آ گیا تھا۔ سیما نے ٹھنڈی سانس لی۔ زندگی کے بعض المیے کتنے افسانوی ہوتے ہیں۔

''ذرا ہٹنا بھیا... اے میاں ذرا بچ کے'' رکشے والے نے زور سے گھنٹی بجائی۔ لاٹوش روڈ پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اس کے متوازی دوڑتی ہوئی سڑک پر امین آباد کے بارونق بازار میں دوکانیں سامان سے پھٹی پڑتی تھیں اور سڑکیں انسانوں کے بوجھ سے۔ یہیں کہیں آس پاس گنئے والی گلی کے اندر ایک پرانے وضع کے بڑے سے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں بطور کرایہ دار

رہنے والے، دوسروں کے لئے ساری زندگی قربان کر دینے والے چھوٹے چچا کوموت کے غیر مرئی ہاتھ نے اٹھالیا تھا اور انسانوں کے اتھاہ سمندر پر اس بوند کے بھاپ بن جانے سے کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ دنیا جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ یسمانے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں۔

☆☆
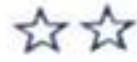
منظوروا

پٹنہ والی چچی اسے موگا کہتی تھیں' امرونی ممانی میلا اور مقامی عورتیں مہیند را۔ یہ تینوں القاب ہم معنی تھے۔ جہاں کام دھام سے فارغ ہوا بس عورتوں کے درمیان گھسا اور ہاتھ مٹکا مٹکا کے گپیں ہانکنی شروع کیں ''اے بھوجی سنیو؟'' ''اے باجی اللہ قسم ہم کہین'' ''ہائے دیا چچی' سہاگن ہوئے کے سفید دوپٹہ' لاؤ' ہم رنگ دیتے ہیں۔''

''اے ہے پرے ہٹ کم بخت۔ اب یہ میرا دوپٹہ رنگے گا'' باہر رنگ ریز مرد ہو یا عورت لیکن گھر کے اندر ان کی آنکھوں کے سامنے ایک جوان مرد وا ان کا دوپٹہ رنگے' چچی اس خیال سے ہی بدک جاتیں گرچہ وہ مردوا گھر کی جان تھا۔ نل ہمیشہ سوکھے پڑے میونسپلٹی والوں کی کارکردگی کا مرثیہ پڑھتے رہتے' بس سڑک پر لگے بمبے میں پانی آتا تھا۔ غریب غربا لائن لگا کر پانی بھر لیتے' اشراف اپنی شرافت لئے پیاسے بیٹھے رہ جاتے۔ جو منظور مہیند را نہ ہوتا تو گھر میدان کربلا بن جاتا۔ وہ سویرے ہی آ جایا کرتا تھا۔ بیسوں بالٹی پانی بھرنے کے بعد بھی تروتازہ اور شاداب' ہنستا' مذاق کرتا' بازوؤں کی مچھلیاں اس کی محنت کشی کی گواہ تھیں اور پھٹے کپڑے زبوں حالی کے۔ اس قدر نیک اور بے ضرر قسم کا انسان تھا کہ گھر کی جوان بہوئیں تک اسے بلا تکلف چھیڑتیں۔ بھاوجوں کی ہنسی کچھ زیادہ بڑھتی تو وہ کھسیا کر خاتون خانہ سینئر یعنی اماں کی طرف متوجہ ہو جاتا'' کا پکا ئیو چچی؟''

وہ اس کے لئے ناشتہ نکالتیں۔ آلو گوبھی کی ترکاری، روٹی اور ایک بڑا مگ بھر کر چائے۔

''اے چچی، گوبھی تو میتھی سے بگھاری اچھی لگتی ہے۔ میتھی نہیں ڈالئیو کا؟''

''لے کم بخت، اب کھائے گا یا عیب نکالے گا؟''

''عیب نہیں نکال رہے ہیں چچی، ترکاری بہت مزیدار ہے۔ بس میتھی...''

''ابے کھا چک اور پھوٹ۔ بڑا آیا اماں کو صلاح دینے والا۔'' انور بھیا کو اماں کے ہاتھ کے کھانوں کے آگے کسی کا پکایا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بدک جاتے۔ دبی زبان سے کہتے ''زنخہ کہیں کا۔''

منظور کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ اس کی موٹی عقل کو کوئی بات اہانت انگیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ برا بھلا تو اماں ہی اسے سنایا کرتی تھیں۔ دراصل اماں بڑی صفائی پسند تھیں۔ پھر مشترکہ خاندان تھا۔ بہت سے لوگ، کئی بچے، سویرے پانی نہ ملتا تو انہیں بڑی دقت ہو جاتی۔

آج بھی وہ منظوروا کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ بیٹھا ہو گا کہیں بھوجی، چچی کرتا ہوا۔ ساڑھے نو بجے خدا خدا کر کے اس کی شکل دکھائی دی تو وہ بڑی زور سے بگڑیں۔ کہاں چلا گیا تھا کم بخت، کلمونہا، داڑھی جار۔ داڑھی جار اماں کی پسندیدہ گالی تھی۔ لیکن جب بھی وہ منظوروا کو داڑھی جار کہتیں وہ بڑی زور سے ہنستا۔ ارے چچی، داڑھی جرے اس کی جس کی ہو یہاں تو داڑھی مونچھ سب صفاچٹ۔ کونو دوسر گاری دیئو چچی۔'' لیکن آج وہ خلاف معمول قطعی نہیں ہنسا۔ کسی اداس گدھے کی طرح لمبی تھوتھنی لٹکائے چپ چاپ بالٹیاں اٹھانے لگا۔

منظوروا ہنسے بولے نہیں، اپنی رائے سے نوازے نہیں، ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا تھا۔ ''کیا ہوا بے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا؟'' انور بھیا نے اسے چھیڑا۔

وہ بالٹیاں اٹھاتے اٹھاتے پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور حیرت اور ہمدردی اور بہت سے ایسے جذبات جنہیں گونگی آنکھیں کھل کر کہہ نہیں پاتیں۔ بس خلط ملط کر کے رکھ دیتی ہیں۔

''بھوجی!'' وہ انور میاں کی بجائے ان کی دلہن سے مخاطب ہوا جو ہاتھ میں بچی کے دودھ کی بوتل لئے کھڑی تھیں، اور یوں گویا ہوا... ''بازار سے آرہے تھے، دیکھا بڑی بھیڑ ہے۔ وہاں کھڑے ہو گئے معلوم ہوا کہ دیو کی نندن بابو کی بڑی بی بی کو کسی نے مار دیا ہے۔''

''اے ہے کسے؟ شیاما دیوی کو؟'' اماں جو باورچی خانے میں بس داخل ہی ہو رہی تھیں،

یکلخت پلٹ آئیں۔

''ہاں چچی۔لو بھلا' بوڑھی آدمی۔سو برس کی عمر' کچھ دنوں میں خود ہی مر جاتیں۔ان سے ایسی دشمنی! جان سے مار دیا چچی۔''

''ابے سو برس تو تو جئے گا قیامت کے بورے سمیٹنے کو۔ساٹھ ستر کی ہوں گی۔کہہ رہا ہے سو برس کی۔''انور بھیا نے لقمہ دیا۔

منظور کو سخت حیرت ہوئی۔بھیا کو تنک افسوس نہیں۔''بے چاری بڑی بھلی مانس تھیں۔''اس نے اتنا ہی کہا۔

''تھیں تو بھلی مانس مگر تو وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''ہم وہاں کھڑے افسوس کر رہے تھے''

کر چکا افسوس؟ جا' اب پانی بھر''۔

''پانی تو ہم بھر ہی دیں گے' ہمارا کام ٹھہرا۔مگر شیاما دیوی کی موت کا افسوس تو ہمیشہ رہے گا۔''

''یہ الو کا پٹھا ایک عدد بوڑھی عورت کے قتل کا افسوس کر رہا ہے۔جو بقول اس کے کچھ دنوں میں خود ہی مر جاتی۔اچھا ہے جو نپٹ جاہل ہے اخبار نہیں پڑھتا ورنہ اب تک افسوس کر کر کے مر چکا ہوتا۔''

''افسوس کی بات تو ہے میاں۔''اماں رسان سے بولیں''جائداد کا جھگڑا بہت دنوں سے سنتے ہیں کہ چل رہا تھا۔لگتا ہے سوتیلے بیٹوں پوتوں میں سے کسی نے...''

انہوں نے بھی کم نہیں ستایا تھا سوتیلی اولادوں کو۔نگوڑی' ناٹھی' اکیلی' اپنی تو کوئی اولاد تھی نہیں۔دیوکی نندن بابو نے دوسری شادی بھی اسی لئے کی تھی۔مگر جائداد کی ہوس میں سب سے کد تھی اب کیا جائداد ساتھ لے گئیں؟''بھیا کا لہجہ بے رحم تھا۔

''پھر بھی، ماں تھیں' دادی تھیں' کیا زمانہ آن لگا ہے۔''منظور وا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

دراصل منظور وا کو بسنت کی خبر نہیں ہے۔اپنی دنیا میں رہتا ہے۔دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔کمپیوٹر اور اسپیس کرافٹ اور لوگوں کو مارنے کی اعلیٰ درجے کی تکنیکیں۔نسل کشی کے منصوبے اور پھر نسل کشی کو فساد قرار دلوانے کی گھاتیں۔ابے منظور وا' احمق الذی' پانی بھر' تیرے میرے گھر کا بچا کھچا کھانا کھا اور ایک دن بغیر نالہ و شیون' نوحہ و ماتم کسی اندھیری گلی میں مارا جا تب تو دیوکی نندن

بابو کی بڈھی بی بی کے قتل پر افسوس کرنا بند کر دے گا۔

منظورواا گلے چار پانچ دنوں تک لگا تار دیو کی نندن بابو کی پہلی بے اولاد بی بی کے اوصافِ حمیدہ اوران کے سوتیلے بیٹوں پوتوں کے اوصافِ خبیثہ کا ذکر کر کے بور کرتا رہا اور ساتھ ساتھ انور بھیا کی بے حسی پر حیرت بھی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی اصلی جون میں واپس آ گیا۔

اسکا دل سب سے زیادہ اسی گھر میں لگتا تھا۔ یہاں ڈھیر سارے لڑکے بالے تھے اور کئی بھوجائیاں۔ اکتوبر کے آخری ہفتے کی شفاف اور نرم دھوپ میں وہ سارے بچوں کو بٹور کر آنگن میں گھوم گھوم کر ناچ رہا تھا اور تالیوں کی تال پر کہہ رہا تھا ''تیل لگاؤ ڈابر کا' نام مٹاؤ بابر کا'' پھر وہ چلایا ''بابر کی اولاد و!'' اور سکھائے پڑھائے بچے کورس میں بولے ''ہندستان چھوڑ دو۔''

دوسرے کمرے میں بیٹھے انور بھیا کو جیسے کسی نے بجلی کا کرنٹ مارا وہ تلملا کر باہر نکل آئے اور سیدھے منظور کی گردن میں ہاتھ دیا۔

''کیوں بے' یہ کیا کہہ رہا ہے اور کہاں سے سیکھ کر آیا ہے؟''

بھیا کا لہجہ اتنا درشت تھا اور گردن پر گرفت اتنی سخت کہ منظوروا بالکل بت بن گیا۔ یہ آج کیا ہوگیا بھیا کو؟ وہ تو فرصت کے اوقات میں لڑکے بالوں کو سمیٹ کر ہمیشہ یہی کرتا آیا ہے ''ہاتھی گھوڑا پالکی۔ جے کنہیا لال کی'' اور ''برسو رام دھڑا کے سے' بڑھیا مرگئی فاقے سے'' پڑوس کے دین محمد سبزی والے کو چڑانے والی کہبت 'محمد دین' ٹکے کے تین' بھی اسی نے محلے کے لونڈوں کو سکھائی ہے۔ دین محمد نے آکر بھیا سے شکایت جڑی تو بھی بھیا اتنے ناراض نہیں ہوئے۔ اتنے کیا وہ تو بالکل بھی ناراض نہیں ہوئے تھے الٹا ہنسنے لگے تھے۔

''بولتا ہے کہ لگاؤں دو جھاپڑ''؟ بھیا نے آنکھیں تریریں۔ وہ واقعی خفا تھے۔

''ترپاٹھی جی کے مکان کی بغل میں جو بڑا میدان ہے وہاں بہت سے لونڈے اکٹھا تھے' وہی نعرے لگا رہے تھے۔ ہمیں بڑا مزہ آیا۔ کوئی بری بات ہے کیا بھیا؟''

''ابے' بابر بہت بڑا بادشاہ تھا اسے ایسا کہتا ہے؟ بڑا آیا نام مٹانے والا اور یہ تو ترپاٹھی جی کے یہاں کام کیوں کرتا ہے؟''

''بھیا' ہمیں جو پیسہ دے گا ہم اس کے یہاں کام کریں گے اب بس آپ کا گھر چھوڑ کر اس محلے میں اور کہیں کام نہیں ہے۔ کئی لوگوں نے اپنے گھر پمپ لگوالئے ہیں۔ اب دو ایک گھر کی

مجوری سے پیٹ کیسے بھرے گا۔''

''اچھا کر،جہاں جی چاہے کام کر۔مگر خبر دار جو اس طرح کی باتیں سیکھ کر آیا ہے'' بھیا نے پھر ڈپٹا

''کیا بھیا؟ کون چی بھیا؟''

''ارے یہی جو بک رہا تھا۔اور بچوں کو سکھایا ہے تو کھال کھینچ لوں گا۔اور ہاں سن...''

''کہیے بھیا۔''

''بابر بادشاہ کا نام ذرا ادب سے لیا کر۔کہہ بابر علیہ الرحمۃ''

''بابر رحمت اللہ۔ان کا پورا نام بابر رحمت اللہ تھا کیا بھیا؟''

انور بھیا کا جی چاہا لگائیں دو جھاپڑ کس کے مگر غصہ ضبط کر کے بولے'' ابے ہم نے کہا تھا بابر علیہ الرحمۃ ،علیہ الرحمۃ یا رحمت اللہ بزرگوں،پیروں،ولیوں کے ناموں میں لگایا جاتا ہے۔''

''بابر میاں ولی تھے اور ہم کہہ رہے تھے نام مٹاؤ بابر کا' ارے توبہ توبہ۔اتنی بڑی بے ادبی۔ معاف کیجئے گا حضور پیر میاں'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور گالوں پر تھپڑ مارے۔بابر رحمۃ اللہ کہہ کر ہاتھوں پر پھونکا اور ہاتھ چومے۔

بھیا کو ایک مرتبہ پھر غصہ ضبط کرنا پڑا۔'' بابر پیر فقیر نہیں تھے،بادشاہ تھے۔بڑے منصف،عادل، صوفی منش۔پڑھنے لکھنے کے شوقین عالموں کے قدردان۔''

''غریبوں کا خیال بھی کرتے ہوں گے تب تو.....'' منظورو انے لقمہ دیا۔کیا اچھا ہوتا جو ہم ان کے وقت میں پیدا ہوئے ہوتے۔پھر تو ہماری شادی بھی ہو گئی ہوتی۔''

''ابے تو جب بھی ویسا ہی رہتا۔چمڑے کی مشک میں پانی بھر کر دلی کی تنگ گلیوں میں کٹورے بجاتا یا کسی گاؤں میں کھیت میں ہل چلاتا' یا پیٹھ پر بوجھ ڈھو رہا ہوتا۔یہ کچھ نہیں تو پھر پیدل فوج میں سب سے آگے توپوں کا چبینا بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوتا۔''

منظورو ا از حد اداس ہو گیا۔وہ یہ سوچ سوچ کر سارے دن کڑھتا رہا کہ وہ اگر بابر بادشاہ کے وقت میں ہوتا تو بادشاہ سلامت بھی اس کی قسمت کا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔پھر بھی بادشاہ تو بادشاہ ٹھہرے ان کا نام ادب سے لینا ضروری ہے۔وہ جا کر تر پاٹھی جی کے پوتوں کو سکھا آیا بابر علیہ الرحمۃ اور خبر دار جو بابر بادشاہ کا نام مٹانے کی بات کی ہے۔پاپ چڑھے گا جہنم میں جاؤ گے۔ وہاں منظورو انہیں ہوگا۔ہاں! منظورو ا تو جنت میں ہوگا بابر بادشاہ کے ساتھ۔کندھے پر چڑھا کے

تب کون لے جائے گا رام لیلا دکھانے''۔

ترپاٹھی جی کی بہو کے کان کھڑے ہوگئے۔''ارے منجوروا کس پاپی کو صوفی' پیر کہہ رہا ہے' نہ جانے کتنے مندر ڈھا دیئے' کتنے ہندوؤں کو مروا دیا۔ باہر سے آنے والا بدیسی آکرانتا۔ کئی بار کہا اماں جی سے کہ اس میاں کو کیوں گھر میں رکھ لیا ہے' نکال لئے اسے۔ سنتی ہی نہیں ہیں۔ جب کہو بس ایک ہی جواب کہ تمہارا کیا بگاڑ رہا ہے۔ کام کر رہا ہے۔ پوجا گھر میں تمہارے کہنے پر ہم اسے جانے نہیں دیتے۔ پھر کیا اعتراض ہے۔ دو دو آدمی آئے گاؤں سے مسٹنڈے کے مسٹنڈے۔ سیر بھر اناج ایک وقت میں کھا جاتے تھے۔ اس پر بھی کام چوری اور نکے بھی تو نہیں۔ بھاگ نکلے اب ہم اپنی سہولت دیکھیں کہ ہندو مسلمان بانچیں۔ اب سنیں اماں جی یہ بکواس جو بچوں کو سکھائی جا رہی ہے۔ خرافاتی کہیں کا۔''

اماں جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھانستی' کراہتی اٹھیں۔''ارے تو سمجھا دو نہ۔ بے چارہ سیدھا ہے۔ دیکھ رے منجوروا۔ ایسی ویسی باتیں کرے گا تو نکال باہر کیا جائے گا۔ ونود بھیا جی کو معلوم ہو گیا تو دو چار جھانپڑ ماریں گے سو الگ۔ بابر نے ہمارے مندر ڈھائے تھے۔''

منظور پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔''ہیں بھوجی؟''

''تب!'' ترپاٹھی جی کی بہو کے چہرے پر خشونت تھی۔

لیکن تب انور بھیا ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔ بھیا بھی پڑھے لکھے ہیں اور یہ بھوجی بھی پڑھی لکھی ہیں۔ منظوروا کے دماغ میں جالے پڑ گئے۔''یہ تو اچھی بات نہیں بھوجی۔ مارنا تو ایک آدمی کا بھی برا نہ کہ لاکھوں آدمی۔ مندر بھی کیوں ڈھایا جائے۔ وہاں تو لوگ پوجا کرتے ہیں۔ مندر ڈھانا چاہئے یہ خیال تو کبھی منظوروا کے ذہن کے آس پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔

''اچھا چل۔ یہ پکڑ راشن کارڈ اور گیہوں چینی لے آ۔'' بھوجی کا چہرہ پل کے پل نرم پڑا۔ پھر خیال آیا کہ چاپلوسی کر رہا ہے مکار۔ میاں مسلمان چرب زبان۔ دل میں کچھ' زبان پہ کچھ۔ پوری قوم ہی مکار ہے۔ مکار اور دغا باز۔

راشن کارڈ تھام کر منظوروا وہیں اطمینان سے پسر کر بیٹھ گیا اور چنوٹی نکال کر سوکھا کھانے کی تیاری کرنے لگا۔''ابھی دکان نہیں کھلی ہوگی۔'' تمباکو پھولتے ہوئے اس نے اعلان کیا'' ہم تھوڑی دیر بعد جائیں گے۔'' بھوجی کا پارہ دوبارہ چڑھنے لگا۔

''منجوروا۔ یہ تیرے بابر نے مندر ہی نہیں توڑا بلکہ ہمارا مندر توڑ کر وہاں اپنی مسجد بھی بنوائی۔''

''ہائے اللہ بھو۔جی کہاں؟''

''اجودھیا جی میں۔ خیر ہم اپنا مندر تو واپس لے ہی لیں گے مگر تو کان کھول کر سن لے۔ یہاں کام کرنا ہے تو خبر دار جو اس چنڈال کا نام لیا۔لٹیرا کہیں کا۔''

''بابر کا نام تو آپ ہی کے گھر سنا بھو۔جی۔ہم تو جانتے ہی نہیں تھے الاقسم۔''

''جھوٹا'لفنگا۔ابھی کیا کہہ رہا تھا کہ بابر صوفی پیر تھا۔ جوتے مار کر باہر کردوں گی۔ جھوٹ بولتا ہے تو!''

جھاڑ تو منظوروا کو اکثر یہاں بھی پڑتی رہی تھی لیکن آج بہو۔جی کے لہجے میں جو تحقیر اور چہرے پر جو خشونت تھی وہ اسے کہیں اندر تک کچوٹ گئی۔ پہلی ساری ڈانٹیں وہ شربت کے گھونٹ کی طرح گٹک گیا تھا ان میں نہ ایسی تحقیر تھی' نہ ایسی دھمکی' نہ ایسی نفرت۔ بلکہ وہ ساری جھڑکیاں ایسی اپنائیت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ اسے محسوس ہوتا تھا وہ اس گھر کا ایک ناگزیر حصہ ہے لیکن آج گھر کی بہو کا مسخ چہرہ ایسا دھار دار خنجر تھا جس نے اس گھر سے اس کی ڈور کاٹ دی تھی۔ باتونی' خوش مزاج' ہر وقت مسخرہ پن کر کے سب کو ہنسانے والا منظوروا بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی زندگی غربت میں کٹ رہی تھی۔ کوئی قریبی رشتے دار آس پاس نہیں تھا۔ کوئی ایسا انسان جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ شدید آرزو کے باوجود ابھی تک بیوی بھی نہیں ملی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔کوئی بڑا دکھ اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ نہ کوئی بڑا اتردد۔اب یہ بابر نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔آسمان سے ٹپکا تھا یا زمین سے اگا تھا یا تاریخ کے ان صفحات سے اچانک باہر نکل آیا تھا جنہیں منظوروا نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ یہ مصیبت۔توبہ توبہ بابر مصیبت نہیں۔ بابر علیہ الرحمۃ۔

انور بھیا تو کہیں باہر نکلے ہوئے تھے۔دل کا دکھ اماں سے کہہ کر اس نے بھڑاس نکالنی چاہی۔ وہ بہت ہی پریشان تھا۔

''ارے منظوروا' پانی بھر۔ میرا دماغ کاہے کو خراب کر رہا ہے۔ارے ہاں کیا کہہ رہی تھی وہ ترپاٹھی کی بہو۔ مسجد توڑے گی؟ ارے ان سب کا کیا ہے۔ تعداد پہ اتراتے ہیں۔کرلیں زور زبردستی۔توڑیں مسجد' مگر مسلمان بھی کوئی ایسے نیمر ذو بر نہیں ہیں۔ارے بھیا تو ذرا آج بچوں کو ساتھ لے جا۔ بستے خرید وادے ان کے۔مہنگائی نے دماغ خراب کر رکھا ہے مگر اسکول والے ہیں

کہ روز نت نئی فرمائشیں ۔ ناک میں دم ہے ۔ کتابوں کا بوجھ اتنا کہ روز بستے پھٹیں ۔ ارے یہ ترپاٹھی کی بہوُ رہا۔ یہ تو درگاہ پہ جاتی ہے۔ایک دن نوچندی جمعرات کے روز ملی تھی۔اندر سے ایسی فرقہ پرست ۔ یہ سب ایسے ہی ہیں ۔ منافق اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ان کی رگ رگ میں مکاری ہے۔ارے منظورواؔ اٹھا بالٹی۔کھڑا کھڑا سر کھجائے جارہا ہے۔''

''نہیں چچی۔ترپاٹھی جی کی بی بی کو کچھ نہ کہنا۔ بڑی نیک ہیں اور ترپاٹھی ماس ساب نے ہمیں اب کی جاڑوں میں گرم چادر دینے کا وعدہ کیا ہے۔آپ کے گھر اتنے دن کام کیا کبھی گرم کپڑا نہ ملا چچی۔''

''ہاں دونوں میاں بیوی ہیں تو نیک'' اماں گرم کپڑے کی بات صفا نظر انداز کر گئیں۔''محرم کے دنوں میں سبیل لگایا کرتے تھے۔'' پھر وہ سر کھجانے لگیں۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہندو نیک ہوتے ہیں یا بد۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ زیادہ تر تو پکے بدمعاش ہیں۔بس ترپاٹھی جی اور ان کی بیوی نیک ہیں اور ایک وہ تھیں بے چاری دیوکی نندن کی مقتول اہلیہ۔

منظورواکے دماغ میں کوئی مسلسل ڈنک مار رہا تھا۔اماں نے اس کی دلجوئی تو کی نہیں ۔بس پانی کے لئے ہڑکایا اور جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہیں۔اس لئے بھیا آئے تو وہ نئے سرے سے تفتیش میں جٹ گیا۔

''ابے پیچھے ہی پڑ گیا تو تو۔اچھا سن۔بابر سنہ 1526 میں ہندستان آیا تھا.....''

منظوروا کی سمجھ میں 1526ء قطعی نہیں آیا۔لیکن یہ آ گیا کہ بابر باہر کہیں سے آیا تھا اور یہ کہ ایک ہندو راجہ نے ہی اسے بلایا تھا اور ایک مسلمان راجہ کے خلاف لڑنے میں اس سے مدد چاہی تھی۔

''بڑا بدمعاش تھا۔مسلمان کے خلاف ہندو کا ساتھ دینے کو چلا آیا۔'' منظوروا نے فیصلہ صادر کیا۔

''چپ بے ملاٹے ۔تاریخ میں نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان ۔صرف فرمانروا تھے اور بادشاہ اور جس کی لاٹھی تھی بھینس بھی اسی کی تھی۔اتفاق سے لٹھیا بابر کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ بھینسوں کی گلہ بانی کرنے لگا۔ابے بھینسیں بھی نہ ہندو ہوتی ہیں نہ مسلمان ۔ وہ بس بھینس ہوتی ہیں ۔مگر کوئی مندر وندر نہیں توڑا بابر نے ۔یہ جھوٹے ہیں جو ایسا کہہ رہے ہیں دراصل اب وہ لٹھیا مکمل طور پر

اپنے ہاتھ میں...''

''ترپاٹھی جی کی بہو کہہ رہی تھیں...''منظوروا بھیا کی بات کاٹ کر ہکلایا۔

''ثبوت لائیں نہ ترپاٹھی جی کی عالم فاضل بہو۔''بھیا نے زور سے میز پر مکہ مارا اور منظوروا ڈر کے مارے اچھل پڑا۔ ہت تیری بابر کی...نہ نہ... بابر علیہ الرحمۃ۔

''ارے میاں۔ کس کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہو اور کیوں؟''ابا پہلی مرتبہ دخل انداز ہوئے تھے۔

''ابا۔ ان لوگوں میں قومی حمیت جگانی ضروری ہے۔ ورنہ یہ جاہل ان لوگوں کے ساتھ مل کر بابر کا نام مٹانے کے نعرے لگائیں گے اور مسجد ٹوٹ جائے گی۔''

''میاں ابھی جو تم بول رہے تھے...وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس...تو یہ معاملہ تو ازلی سچائی ہے۔ زمان و مکان سے پرے۔ اسے کیوں بھول رہے ہو۔ مسجد تو میاں ٹوٹی سمجھو۔ اور ذرا سی تصحیح کرلو۔ لٹھیا یہ ہاتھ میں لینا نہیں چاہ رہے، وہ ان کے ہاتھ میں عرصہ ہوا کہ آ چکی ہے۔''

ہماری مسجد کوئی کیوں توڑے گا؟ سیدھے سادے کبھی ناراض نہ ہونے والے منظور کو سخت غصہ آیا لیکن اس سے بھی زیادہ غصہ اسے جب آیا جب اسے بابر کی اولاد کہا گیا۔ بابر بادشاہ ہوں یا کوئی علیہ الرحمۃ، منظوروا تو صرف اپنے باپ کی اولاد تھا۔

ترپاٹھی جی کے گاؤں سے ایک لمبا تڑنگا' کالا کلوٹا' مچھیش' اکثر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ رشتے میں ان کا بھائی لگتا تھا۔ عام لوگوں کی طرح منظوروا کو چھیڑ بھی لیا کرتا تھا۔ لیکن اس بار جو آیا تو اس کی نظریں ذرا ٹیڑھی ٹیڑھی سی تھیں۔

وہ نومبر کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ بس پہلا ہفتہ گذرا تھا۔ اس دن فضا ساکت تھی۔ شہر میں سناٹا تھا۔

ہر شخص سہما سہما سا تھا۔ یم راج نے اپنے کارندوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور وہ آسمانوں سے زمین کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔ سر سر سر سر...

''جہاں تم کام کرتے ہو وہاں تو آج ماتم پڑا ہوگا۔''مچھیش نے منظوروا کو چھیڑا۔

''نوج جو چچی کے گھر ماتم پڑے۔ ماتم پڑے دشمنوں کے گھر۔ ارے بھیا کاہے کو بن ناحق مونہہ بھر بھر کے کوستے ہو۔ کیا بگاڑا ہے انہوں نے تمہارا؟''

منظوروا حیران رہ گیا تھا۔ بھلا چچی سے اس مجیش کو مطلب۔

''ابے بابر کی اولاد، چپ! بڑا بڑھ بڑھ کے بولتا ہے۔''

''ہمارے والد صاحب کا نام ہینکن مستری تھا۔ خبردار جو کسی بابر وابر کو ہمارا باپ بنایا۔''

منظوروا کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی سے اس نے اس طرح آنکھیں نکال کر بات کی تھی۔ وہ تو نہایت سیدھا سادا، امن پسند انسان تھا۔ اکثر طعنے تو اس کی سمجھ سے بھی پرے ہوا کرتے تھے۔

''ہی ہی ہی........کیا کرلے گا تو؟'' مجیش کے لہجے میں تضحیک تھی۔

منظوروا سر کھجانے لگا۔ وہ کیا کرلے گا اس پر تو اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہی کہا تھا بڑے مالک نے کہ بھینس تو آج بھی اس کی ہے جس کی لاٹھی۔ وہ منحنی سا چھوٹا سا پدی سا آدمی اس لمبے چوڑے بھوت کا کیا بگاڑ لے گا۔ بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کریں گے کیا بھیا جی۔ مگر یہ شرافت نہیں ہے۔''

''ہمیں شرافت کا سبق پڑھائے گا۔'' یکا یک وہ چٹان کی طرح آگے سرکا اور منظوروا کے سر پر آ گیا۔ کس کس کر دو جھاپڑ رسید کئے اسے۔

ترپاٹھی جی کی بی بی ہائیں ہائیں کرتی دوڑیں۔ ''کیا کرتے ہو چھوٹے لالہ جی۔ بے چارہ سیدھا سادا آدمی۔'' وہ ہاتھ پکڑ کر منظوروا کو الگ لے گئیں۔ ''جا بیٹا' آج گھر جا' اور ابھی کچھ دن اور یہاں مت آئیو۔'' ان کے لہجے میں سرد کار تھا۔

منظوروا کچھ دن کیا، پھر کبھی نہیں آیا۔ ایک تنگ گلی میں اس کی گردن ریتی لاش پائی گئی۔ مرتے وقت بھی اس کے دماغ میں جالے لگے ہوئے تھے اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا تھا کہ بابر سے اس کا کیا رشتہ تھا اور کیوں تھا اور اس کا باپ زمانہ قبل مسیح میں پیدا ہونے والا ہینکن مستری تھا یا 1526ء میں ہندستان آنے والا ظہیر الدین محمد بابر۔ زمان و مکان سے اوپر اٹھ چکا تھا گردن رتیا منظوروا۔

☆☆

نتھو بدھو خیراتی کو گھن آتی ہے

دسمبر کی صبح کی یخ بستہ ہوا نتھو کی پتلی چادر میں چھید بناتی ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ سورج کی ٹھٹھری، سہمی کرنیں ہلکے بادلوں کو چیر کر باہر آتی مریل دھوپ بکھیر رہی تھیں، ایسی مریل کہ دھوپ پر چاندنی کا گمان ہو۔ ٹین مٹی اور پھوس سے کھڑی کی گئی جھگی کے دروازے پر ستر چھیدوں اور بہتر پیوندوں والا پردا لٹک رہا تھا۔ دروازہ بس اتنا ہی تھا کہ مکین بیٹھ کر اندر گھس سکیں اور پھر بیٹھے بیٹھے ہی اپنی ''اندرون خانہ'' زندگی گذار سکیں۔ کھڑے ہو پانے کی آسائش صرف صاحب خانہ یعنی نتھو کے تین سالہ بیٹے کو حاصل تھی۔ جاڑوں کے جاڑوں پردے کی مرمت کرنے کے لئے نتھو کی بیوی مختلف رنگوں اور قسموں کے کپڑے کہاں سے لاتی تھی اس کی تاریخ اسے خود یاد نہیں رہ جاتی تھی۔ بیشتر کپڑے انتہائی درجے کی غلاظت میں سنے کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ملتے تھے جنہیں وہ پاس بہتے نالے میں سکھا کر مصرف میں لاتی تھی۔ اس مالِ غنیمت کی ایک پوٹلی اب بھی اس کی جھونپڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ فی الحال وہ چپ چاپ بیٹھی ٹٹول ٹٹول کر اپنے بالوں سے جوئیں نکالنے میں مصروف تھی۔

''ارے اٹھ نا۔'' نتھو غرایا۔

''اٹھے تو ہیں۔'' اس نے ناخن پر رکھ کر جوں مارتے ہوئے جواب دیا۔

''تو باہر نکل۔''

''باہر نکل کے کیا کریں؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

نتھو سر کھجانے لگا۔ ایک گھنٹہ پہلے جب سورج نکلنے کے آثار تک نہیں تھے اور چڑیوں نے محض کسمسانا شروع کیا تھا وہ دس گز کی دوری پر بہتے نالے کے کنارے حوائج ضروری سے فارغ ہو آئی تھی۔ نتھو اور اس کا بڑا لڑکا بھی نبٹ لئے تھے۔ دھیرے دھیرے اور لوگ بھی آتے گئے اور ایک لائن سے لگی ڈھیریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ نالے کے پیچھے بچھی ریل کی پٹریوں سے گذرتی ریل گاڑی میں بیٹھے کچھ نفاست پسند لوگوں نے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لئے۔ نالے کے آس پاس گھومتے ٹہلتے سور ایک دوسرے کو تھوتھنی مارتے کچھ زیادہ فعال ہو اٹھے۔

باہر نکل کے کیا کریں۔ بلکہ باہر کے نئے معنی اب کیا ہیں؟ جھونپڑی کے آگے دو فٹ، تین فٹ۔ 'باہر' اب اتنا ہی تھا اس سے آگے نہیں تھا اور نہ جانے کب تک نہیں تھا۔

ارے بھائی بدھو یہ کرفیو کب تک چلے گا؟ نتھو نے کسی بل سے جھانکتے چوہے کی طرح سر باہر نکالا، ہاتھ بڑھا کر ڈھیلا اٹھایا اور جھونپڑی کی دیوار پر پیشاب کرتے کتے کو کھینچ مارا۔

بدھو کی جھونپڑی پوری مٹی کی تھی۔ بانس کے ٹٹر کھڑے کر کے اس نے ان پر مٹی کی موٹی پرت لیپ دی تھی اس لئے وہ ٹین، چیتھڑوں اور پھوس کے مقابلے میں چکنی اور ستھری نظر آتی تھی۔ گرچہ اس کا سائز اغل بغل کی دوسری جھونپڑیوں جتنا ہی تھا پھر بھی اوروں کے مقابلے بدھو کے پاس جگہ کچھ زیادہ تھی۔ بلکہ بقول اس کے پڑوسیوں کے 'بہووت' زیادہ۔ اس کا کنبہ جو اسکی بڑھیا، ایک بیوہ لڑکی اور دو چھوٹی نواسیوں پر مشتمل تھا، گاؤں میں رہتا تھا۔ اس لئے جھونپڑی پوری کی پوری اس کی تھی۔ کسی حاسد لڑکے نے اس کی جھونپڑی کے چکنے پن اور اکیلے بدھو کے لئے اتنی زیادہ جگہ سے چڑ کر اس کی دیوار میں ایک چوڑا سا چھید کر دیا تھا۔ دو ڈھائی انچ موٹی مٹی میں چھید کرنے کے لئے کچھ ایسی زیادہ ''کرسیوا'' درکار نہیں تھی۔ دو پھاوڑوں کی بھی نہیں تھی اس کی جھونپڑی۔ بدھو نے اس بڑے سے چھید پر ایک اخبار چپکا لیا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے تیز ہوا سے پھڑ پھڑا کر وہ اخبار چھید پر سے آدھا نیچے گر گیا تھا۔

بدھو نے اس چھید میں سے اپنا بوڑھا' کسی چار ہزار برس پرانی ممی جیسا سوکھا چہرہ باہر نکالا۔ موتیا بند کے آپریشن کے بعد اس چہرے پر بھاری فریم والا موٹا چشمہ لگانے سے اس کی صورت کسی نیولے سے مشابہ ہوگئی تھی۔ وہ ردی کا کاروبار کرتا تھا۔ بہت بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے زیادہ چل نہیں پاتا تھا' نہ ہی زیادہ بوجھ ڈھو سکتا تھا۔ بس کبھی دس' کبھی پندرہ' اتنا ہی منافع ہو پاتا تھا۔ دو روٹیاں خود کھاتی تھیں اور باقی کنبے کے پیٹ میں ڈالنے کے لئے پیسہ گاؤں بھیجنا ہوتا تھا۔ دن بھر ''ردی کا گد بیچا، لوہا ٹینا بیچا'' کی آوازیں لگاتا' مدھم چال سے گھومتا پھرتا۔ آپریشن اور چشمے کے باوجود آنکھوں سے دکھائی کم دیتا تھا۔'' ..ارے کیا تھوتھن نکال کے دیکھ رہے ہو بدھو بھائی۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ کرپھئیو کب تک چلے گا؟''

''ہم لگائے ہیں کا جو ہم سے پوچھتے ہو؟ پوچھو نہیں سب سسرن سے'' اس کی آواز میں انتہائی درجے کی بیزاری تھی۔

''ارے بدھو' نشچنت ہو کے بیٹھے ہو۔ تمہارے پاس ردی کاغذ خریدنے کے لئے جمع پونجی رکھی ہے وہی نکال نکال کے کھاتے رہو گے۔''

بدھو نے دل ہی دل میں نتھو کو گالی دی ''ابے جمع پونجی کھا جائیں گے تو جب کرپھئیو کھلے گا تو لوگ ہم کو مفت میں ردی دیں گے کیا؟''

''پھر بھی بھوکے تو نہیں مرو گے۔ پونجی کا انتظام بعد میں کہیں نہ کہیں سے کر ہی لو گے۔ پرانے آدمی ہو۔ جس کے یہاں ردی دیتے ہو وہی تمہیں پونجی دے دے گا۔''

''روپیہ کھائیں گے کیا؟ سسر کے ناتی۔ بورہے' سمجھ میں آتا ہے کہ نہیں؟ آج ایکو گھنٹے کی ڈھیل نہیں ملے گی۔ تھوڑا بھات ادھر بھی دے دینا۔ یہاں تو ایک جون کا بھات بھی نہیں ہے۔''

بدھو کھانا چھپریا تلے کھایا کرتا تھا۔ وہاں ایک عورت کڑھائی میں خوب مرچوں اور شوربے والی سبزی پکاتی تھی اور موٹی موٹی کھپرے جیسی لال لال' خوب سنکی ہوئی روٹیاں۔ چھپریا کے ٹھیک نیچے نالا بہتا تھا۔ اس میں پالتو بطخیں قیں قیں کرتی گھومتی رہتی تھیں۔ سور چھپا چھپ کرتے تھے۔ نیچے نالا اور بغل میں سامنے کی کالونی کے فلیٹوں میں رہنے والے لوگوں کے گھر کے کوڑے کے انبار۔ کتے اس میں سے جھوٹن کھینچتے تھے اور جھگیوں میں رہنے والوں

کے لڑکے کہنی تک ہاتھ ڈال کے دودھ کی پولی تھین والی خالی تھیلیاں۔ عورتیں کچھ چیتھڑوں کی تلاش میں کوڑا گھنگھولتی تھیں۔ اس ساری گندگی، بدبو اور کیچڑ سے بے نیاز بدھو، مرچوں کے مارے سوں سوں کرتا، کھانا کھاتا رہتا تھا۔ جب سے کرفیو لگا چھپریا تلے تین ٹانگوں کے تخت پر چلنے والا وہ ہوٹل بند ہو گیا تھا۔ عورت مایوس چہرہ لئے، گود کے بچے کو کندھے سے لگائے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا مرد جو کبھی راج مزدور کا کام کرتا تھا ایک عمارت سے گر کر تقریبا اپاہج ہو گیا تھا۔

نتھو سر کھجانے لگا بلا وجہ ان بڈھو کو چھیڑنے کی غلطی کی۔ اب وہ ان کے لئے بھات کہاں سے لائے۔ ڈبے میں بس ایک وقت کا چاول ہے وہ بھی کھینچ تان کر پورا پڑے گا۔ نتھو کا خیال تھا کہ اسے دو حصوں میں پکایا جائے۔ ایک وقت بالکل کچھ نہ کھانے سے اچھا ہے کہ دو وقت تھوڑا تھوڑا کھا لیا جائے۔ گھر میں نہ نمک نہ تیل، آلو کی کون کہے۔ چاول کے علاوہ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔

''بدھو بھائی معاف کرنا بھات تو نہیں کھلا سکیں گے۔ خیراتی سے کہئے۔ شاید اس کے پاس کچھ فالتو چاول ہو۔'' اس نے ہمت بٹور کر آخر کہہ ہی دیا۔

''بدھو نے تھوتھنی کا رخ دوسری طرف کر کے آواز لگائی'' کھیراتی ہو......او......''

''کیا ہے جی؟''

''کچھ کھانے کو ہے گھر میں؟''

''ہے تو۔''

''ہم کو بھی تھوڑا ہو جائے گا؟''

''ہو جائے گا''

''کیا چیز ہے جی؟ روٹی کہ بھات؟'' بدھو کا دل بانس بانس بھر اچھلنے لگا۔ امید نے مایوس، اندھیرے دل میں ایک کرن جگائی۔ اس لئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بے صبری سے جواب کا انتظار کیا۔

''موٹا سا چوہا دوڑ رہا ہے چاروں طرف۔ ابھی پکڑتے ہیں۔''

بدھو نے روانی سے گالیاں دینی شروع کیں۔'' ہم موسہر ہیں کیا جو چوہا کھائیں گے۔

ابے موسہڑ تو' تیرا باپ۔ باپ کا تو تیرے پتہ بھی نہ ہوگا مگر ہوگا جرور موسہڑ تبھی تیری بخر چو ہے پر جاتی ہے مسکھری کرتا ہے سالا۔ ارے یہ مسکھری کا سمے ہے؟''

خیراتی ہو ہو کر کے ایک پھو ہڑسی ہنسی ہنسنے لگا۔ گر چہ وہ ہنسنے کا وقت قطعی نہیں تھا۔ اس کے چھ ماہ کے لڑکے کو ایک گھنٹے کے اندر تیسری مرتبہ اجابت ہوئی تھی۔ شاید اس کے پیٹ میں درد بھی تھا جس کی وجہ سے وہ مستقل روئے جا رہا تھا۔ خیراتی کی بیوی نے ایک ہاتھ سے لڑکے پر ایک چلو پانی ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے مٹی کا فرش لیپنے لگی۔

جھگیوں میں رہنے والے کوئی پچاس کنبوں میں خیراتی سب سے زیادہ ہنسوڑ تھا۔ کوئی بیس اکیس برس کا کالا کلوٹا لونڈا۔ اسٹیشن پر خوانچہ لگاتا تھا۔ سامنے والی کالونی سے نکلنے والی صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس عورتیں ادھر سے نکلتے وقت ناک پر رومال رکھتیں یا کسی عورت کو کھلی جگہ میں بچے کو پاخانہ کراتے دیکھ کر گھن سے تھوکتیں تو وہ بڑی زور سے ہنستا۔ یہ بھی کوئی گھن کھانے کی چیز ہے۔ اپنے بچے کا پاخانہ۔ اب بھلا کون ایسی عورت ہے جس نے بچے نہ جنے ہوں۔

یہ لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں؟ گھن نہیں آتی؟ گھٹنوں تک کیچڑ۔ کوڑے کے ڈھیر۔ دو رو یہ انسانی فضلے کے ڈھیریاں۔ بدبودار نالا ان سب کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتے رہتے ہیں۔ نہاتے بھی ہیں۔ گردن کا میل پیٹھ پر' پیٹھ کا میل ٹانگوں پر۔ صابن تو شاید ہی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ گندے چیتھڑے اتارے' ویسے ہی گندے پہن لئے۔ ایک مرتبہ تعلیم بالغاں کے کسی ادارے سے وابستہ کچھ خواتین یہاں آئی تھیں۔ وہ رضا کارانہ طور پر سوشل ورک کر رہی تھیں کہ ان کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے نتھو، بدھو' خیراتی کی بیگمات کو تعلیم کے فوائد سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''پڑھ کے کیا ہوگا؟ ہم سڑک پر روڑی کوٹتے ہیں۔ پڑھ لیں تو نوکری دیجئے گا؟'' نتھو کی بیوی نے گھونگھٹ کی آڑ سے پوچھا تھا۔

''ارے بھائی' پڑھ کر کیا صرف نوکری کی جاتی ہے؟'' ایک خاتون نے جھنجھلاہٹ ضبط کر کے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تب تو پھر پڑھ لکھ کر بھی روڑی ہی کوٹیں گے۔''

''دیکھو کتنی گندگی ہے یہاں۔ کس طرح رہ رہے ہو تم لوگ۔ پڑھ لوگی تو ٹھیک سے رہنا

آ ئے گا۔ صفائی کی ضرورت سمجھو گی۔ صاف ستھرے طریقہ سے رہو گی۔''

ایک اور خاتون نے مورچہ سنبھالا تھا لیکن تبھی بدھو کی بیوی اس کی بات کاٹ کر کمر پہ ایک ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی اور دوسرا اس نفیس، کلف لگی، لانڈری سے تازہ تازہ نکلی جیسی خاتون کے ٹھیک موہنہ کے پاس نچا کر بولی۔ ''ارے کیا صابن دے گا تیرا باپ؟ یہاں کھانے کو جڑتا نہیں۔ صفائی سکھاوے گی روز بدلنے کو ساڑی دے گی؟''

اس فصیح و بلیغ زبان اور اس طرح کے ہاتھ کے اشاروں سے ان خاتون کا پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور گھر آ کر روئیں بھی۔ ''ان جنگلیوں کو یوں ہی رہنا ہے نالی کے کیڑوں کی طرح۔'' خیراتی کی بیوی ذرا نرم مزاج اور کم سخن تھی اس نے بعد میں بدھو کی بیوی سے کہا'' چاچی کہیں ایسے بات کی جاتی ہے؟ کچھ برا تو نہیں بول رہی تھی وہ عورت۔''

''تب کیسے کریں بات؟ یہ چھنال سب بڑھیا بڑھیا کپڑے پہن کر قانون چھانٹتی ہیں پہلے پیٹ بھریں کہ پڑھیں؟''

''ارے بھائی بدھو، کل سے شاید کرفیو میں کچھ ڈھیل پڑے تو ردی مارکٹ میں دے آنا اور پیسہ اٹھا لینا۔ آج بھر کی بات ہے۔'' نتھو کہہ رہا تھا۔

بدھو کے پیٹ میں بھوک مروڑ بن کر ٹھوکریں مارنے لگی۔ بڑھاپے میں خالی پیٹ برداشت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ کل رات کو کچھ نہیں کھایا تھا۔ بس دوپہر منہ جُھٹالا تھا۔ آج پورے دن کچھ نہ ملا تو؟ یہ تو خاصہ ڈراؤنا خیال تھا۔

لیکن کچھ ملنے کا سوال ہی کہاں رہ گیا تھا۔ رات ہوتے ہوتے بدھو تیسرا فاقہ برداشت کر رہا تھا۔ خیراتی کی وقت بے وقت پھوٹنے والی ہنسی بھی رکی پڑی تھی اور اس کے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ اس کا بچہ دستوں سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اب وہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ گردن ڈالے چپ چاپ پڑا ہوا تھا جیسے انسان کا بچہ نہیں، مٹی کا لوندا ہو۔ گمٹی پر جو جھولا ڈاکٹر بیٹھتے تھے وہ سستی ہومیو پیتھک دواؤں اور کچھ جڑی بوٹیوں سے ان جھگی باسیوں کی چُٹ پُٹ بیماریوں کا علاج کر دیا کرتے تھے۔ پہلے پوسٹ مین تھے۔ ریٹائر ہونے سے کچھ دن پہلے

ہومیو پیتھک طریقہ علاج اور جہاں ڈاکٹر نہ ہو جیسی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ اتفاق سے ان کے ریٹائر ہونے کے کچھ دن بعد ہی بدھو پان والا ممبئی چلا گیا اور ڈیڑھ سو روپے میں اپنی گمٹی انہیں دے گیا۔ جھگی جھونپڑی والے معمولی بیماریوں کو تو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے تکلیف زیادہ بڑھے تو جھولا ڈاکٹر کے پاس سے روپے ڈیڑھ روپے میں دوا لے آتے تھے۔ مہینے میں دو ڈھائی سو کما لیا کرتے تھے ڈاکٹر صاحب۔ پینشن تو بہت ہی قلیل تھی۔ ابھی ان کا ایک لڑکا باقی تھا جس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ بیوی تھیں اور ایک بیوہ بہن ساتھ رہا کرتی تھیں۔ خیریت تھی ان کی کوئی اولاد نہیں تھی سننے میں آ رہا تھا کہ جھولا ڈاکٹر مار دیئے گئے۔ نتھو قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اسے گشتی پولس کے ایک سپاہی سے یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ ان سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ خیراتی کو قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ابے کسی کو مارنے کے لئے دشمنی کی کیا ضرورت ہے؟''

پھر بھی۔ جھولا ڈاکٹر۔ بوڑھے منمنی سے دو ہڈی کے آدمی۔ ریٹائر ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ موٹا سا چشمہ لگائے جھولے میں جھانک جھانک کر دوائیں ٹٹولتے رہتے تھے کبھی کوئی دوا نہ دے کر مفت صلاح دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً'' جاؤ پان کا ایک ٹھو پتہ لے لو۔ اس پر کڑوا تیل لگائے کے گرم کر کے باندھ لو۔ دوائی کی ضرورت نہیں ہے ایسے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' لالچی بالکل نہیں تھے۔ بھلا انہیں کیوں مارا؟ دو چار برس میں خود ہی مر جاتے۔ لوگ انسانوں کی مدد کرتے نہیں ملک الموت کی مدد کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی بالواسطہ تو کبھی بلاواسطہ۔ بلا واسطہ یوں کہ دوسرے دن خیراتی کا بچہ مر گیا تھا۔ وہ اس کا پہلا بچہ تھا۔ اس کی بیوی جھونپڑی کے فرش پر سر پٹک پٹک کر رو رہی تھی۔ دوسری جھونپڑی میں نتھو کے بچے بھوک سے رو رہے تھے اور بوڑھا بدھو۔ وہ تو اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ اس کے اندر رونے کی بھی سکت نہیں تھی۔ دو ایک دن اور ایسے ہی گذر گئے تو ہم بھی مر جائیں گے۔ پتہ نہیں بڑھیا کو اس کی خبر بھی مل پائے گی یا نہیں۔ کیا کرفیو میں ہماری لاش بھی ایسے ہی بے کریا کرم پڑی رہے گی جیسا کہ سنتے ہیں کہ جھولا ڈاکٹر پڑے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اس سے قبل کہ وہ بھوک سے مرے وہ لوگ آ جائیں جو یم راج کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ ان کے آنے پر سڑکوں پر خون بکھر جاتا ہے اور جھونپڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کریا کرم کے لئے مرنا بھی ضروری نہ ہو۔

اس کا دبلا پتلا لمبوترہ چہرا خوف سے اور بھی مسخ ہوا تھا۔ وہ بے آواز رونے لگا تھا۔ کسی ایسے بچے کی طرح جو اپنا وقت پورا ہونے سے پہلے پیدا ہو گیا تھا اور اپنے وجود کا احساس دلانے سے قاصر تھا۔

جوان اور مضبوط نھو کو تین دن کے فاقوں نے توڑ ضرور دیا تھا لیکن وہ بدھو جیسا بوڑھا اور کمزور نہیں تھا۔ اس لئے وہ رو نہیں رہا تھا گشت کے سپاہی سے اس نے پوچھا تھا کہ کرفیو کب تک ختم ہونے کی امید ہے ''آج کوئی مرا نہیں ہے اس لئے کل کچھ ڈھیل ضرور دی جائے گی'' اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ فکر مند چہرے کے ساتھ نھو نے بدھو کی دیوار کے چھید سے اندر جھانکا۔ بڑھو بچے کہ چل بسے۔ اس نے سوچا مگر دیکھا کہ بدھو فرش پر چاروں خانے چت پڑا ضرور تھا لیکن اس کا ہڈیوں بھرا سینہ پھولتا پچکتا دکھائی دے رہا تھا۔ مرا نہیں ہے۔ نھو نے اطمینان کی سانس لی اور پکار کر بولا ''کل سویرے کرفیو میں ڈھیل دی جائے گی۔ بھائی اتنے پیسے ادھار دے دینا کہ ہم پاؤ روٹی چائے لے آئیں۔ بہت جلدی لوٹا دیں گے اور ہاں تمہارے لئے بھی کچھ لیتے آئیں گے۔'' اس کے لہجے میں بے انتہا لجاجت تھی۔

کرفیو میں کل کسی وقت ڈھیل ضرور دی جائے گی اور بدھو کے پاس اس وقت وہ ہے جو دنیا کا ہر تالہ کھول دینے کے لئے ماسٹر کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیسہ۔ یہ تھوڑا سا پیسہ بدھو کی پونجی ہے جسے لے کر وہ لوگوں کے گھروں سے ردی خرید کر لاتا ہے۔ ابھی خیراتی بھی اس کی خوشامد کر کے گیا ہے کہ وہ اسے تھوڑے سے پیسے ادھار دے دے جس سے کچھ کھانا میاں بیوی کے پیٹ میں پڑ جائے۔ بوڑھا' بدصورت' ادھ مرا بدھو اس وقت بہت اہم ہستی بن گیا تھا۔ کرفیو میں چند گھنٹوں کی ڈھیل میں نھو بدھو خیراتی نے کچھ خرید کر پیٹ میں تو ڈال لیا لیکن ان کی کمائی کا کوئی ذریعہ کام نہ آیا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں مہاوٹ الگ برس گئی۔ پانی نے آس پاس کا کوڑا کرکٹ بھگو دیا تھا۔ جلانے تک کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بھیگے کوڑے کے انبار مہک اٹھے تھے نالا اور زیادہ بجبجا گیا تھا۔ گدلا کیچڑ سڑک تک آ گیا تھا۔ اس ساری گندگی سے گھرے وہ انسان کیچوؤں جیسے لگ رہے تھے۔ کہیں رینگتے کہیں کنڈل مارے۔ مگر وہ سب پُر امید تھے۔ ڈھیل کے بعد کہیں کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ اب دن کا کرفیو ہٹ جائے گا۔ لوگ

اپنا اپنا دھندہ شروع کریں گے۔ بس آج کی رات کاٹنی ہے۔ پھر شاید کل رات کو پورا کھانا پیٹ میں پڑے گا۔ گرم روٹی یا گرم بھات ساتھ میں آلو کی سبزی۔ تھوڑی ہری مرچ کی چٹنی۔ انہیں ہر طرف کھانا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ دال چاول کے بیچ چھپ چھپ کرر ہے ہیں۔ چھپریا تلے عورت نے اتنے بڑے کڑاہ میں سبزی بنائی ہے کہ ساری جھگیاں ہلدی مرچوں والے شوربے میں ڈوب گئی ہیں۔

اچانک پولس جیپ کسی مہیب دیو کی طرح برآمد ہوئی اور لاؤڈ اسپیکر چیخنے لگے۔ دوبارہ مکمل کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ حالات سدھرتے سدھرتے پھر بگڑ گئے تھے۔ رات کچھ شرارتی عناصر نے ایک کیسٹ لگا دیا تھا اللہ اکبر، ہر ہر مہادیو کے نعرے۔ چیخ پکار، آہ بکا۔ نتیجے میں ایک مسلح ہجوم نے ایک بستی پر حملہ کر دیا۔ کشیدگی نے جاتے جاتے پھر پلٹ کر اپنا بھیانک چہرہ ان کی طرف کیا۔ چاروں طرف دکھائی دینے والا کھانا کیچڑ میں تبدیل ہو گیا۔ ناامیدی، غصے اور بھوک نے خیراتی کا چہرہ مسخ کر دیا۔ انتہائی کراہیت اور تنفر کے ساتھ تھو نے بڑے زور سے تھوکا ’’ گھنا دیا ہے دیش کو سالوں نے۔ گھنا دیا ہے۔‘‘

☆☆

چھوٹی ریکھا بڑی ریکھا

بادلوں کی وجہ سے شام وقت سے پہلے ہی گہری ہوگئی تھی۔ تیج ناتھ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور پھر منو بھیا جی کی طرف دیکھا۔ منو بھیا جی نے آج ہی اسکول میں ''بڑے او'' کی ماترا سیکھی تھی۔ ایک ہاتھ ٹھڈی پر لگائے دوسرے ہاتھ میں قلم لئے ہوم ورک کی کاپی پر وہ کچھ اس طرح جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی بوڑھا' جغادری فلسفی کسی اہم فلسفیانہ مسئلے پر غور کر رہا ہو۔ تیج ناتھ کی گہری نظر کو انہوں نے ٹارچ کے فوکس کی طرح اپنے چہرے پر محسوس کیا لیکن اسکی طرف دیکھا نہیں' سر اٹھائے بغیر بڑی سنجیدگی سے بولے ''تیج ناتھ ہم تم میں بڑے اُو کی ماترا لگا دیں ؟''

''لگا دیجئے بھیا جی' جو چاہے لگا دیجئے' مگر ذرا جلدی چھٹی کر دیجئے ہماری''

''اگر ہم تم میں بڑے او کی ماترا لگا دیں تو کیا بن جاؤ گے پتہ ہے؟''

''ہم کچھ نہیں بنیں گے بھیا جی۔ ہم وہی رہیں گے جو ہم ہیں''

عام طور پر خوش خوش رہنے والے تیج ناتھ اس وقت کچھ کھسیائے ہوئے تھے' ان کے ذہن پر فکر سوار تھی' اگر کہیں پانی برسنے لگا تو گھر پہنچتے پہنچتے بھیگ جائیں گے۔ اندھیری سی کوٹھری میں اکیلے رہتے تھے' اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ لگتا ہے آج ستو پر گذارا کرنا ہوگا۔ یہ ستو کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ اب تو صاحب لوگ فرمائش کر کے بیسن کی روٹی کھاتے ہیں گیس کی شکایت ہو تو چنے

کا ستو پیتے ہیں۔ مہنگا تو ہونا ہی ہے۔

منو بھیا جی نے تیج ناتھ کے کمنٹ اور افکار کو قطعی نظر انداز کر دیا'' تم وہی نہیں رہو گے تیج ناتھ' تم بن جاؤ گے۔ تے جو............ ناتھو...... تیجو ناتھو۔'' پھر وہ آنکھیں میچ کر مسکرائے۔

تیج ناتھ کو محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کا کارٹون بنا دیا ہو۔ دو بتے میں پھیلی ناک' سوپ جیسے کان، چیاں جیسی آنکھیں۔ اچانک ساری فکریں بھلا کر وہ کھل کھلا کر ہنسے' ساتھ میں ہنسے منو بھیا جی۔ '' آؤ تمہیں دکھائیں'' انہوں نے سلیٹ اور رنگین چاک اٹھاتے ہوئے کہا۔

'' بس بس!'' بادل امڑ گھمڑ کرنے لگے تھے۔ تیج ناتھ کی ہنسی جیسے اچانک پھوٹی تھی ویسے ہی اچانک رک گئی '' اب اور مسکھری نہیں' جلدی کام ختم کیجئے اور چلئے نیچے۔ پانی آنے ہی والا ہے۔''

تیج ناتھ کی دن بھر کی ڈیوٹی کا یہ '' گرینڈ فنالے'' ہوا کرتا تھا۔ بھیا جی کو نیچے پارک میں کچھ دیر کے لئے گھمانے لے جانا۔ وہاں وہ کچھ ہی دیر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ کھیل ختم ہو جانے پر بھی اگر وہ کچھ دیر اور نیچے ہی رہنا چاہتے تو تیجناتھ کے پاس بیٹھ کر اس سے گپ کرتے' کوئی کہانی سنتے یا پہیلیاں بجھاتے۔

بارش آگئی تو ممی ہرگز نیچے نہیں جانے دیں گی۔ منو نے جلدی جلدی کاپی' پنسل' سلیٹ بستے میں بند کی اور نیچے آگئے۔ خوش خرم' صحت مند بچے حسب معمول اس کثیر منزلہ سرکاری عمارت سے متصل پارک میں شور مچا کر کھیل رہے تھے۔ سبز گھاس پر رنگی برنگی پوشاکوں میں ملبوس' دوڑتے پھدکتے' چھوٹے چھوٹے ہیولے' کبھی وہ رنگین چڑیوں جیسے لگتے' کبھی تیتریوں جیسے' کبھی لان میں اگے ہوئے پھولوں کی طرح محسوس ہوتے۔ تیج ناتھ منو بھیا جی کو انہیں جیسے ان بچوں کے درمیان چھوڑ کر وسیع وعریض پارک کے ایک کنارے اکڑوں بیٹھ گئے۔ ان کے ذہن میں اپنے لئے ایک تشبیہ آئی۔ بھورے رنگ کا بڑا سا پتھر' بے ڈول ان گھڑ۔ یا تال کے کنارے بیٹھا بھدا سا مینڈک۔ وہ دل ہی دل میں ہنسے اور آسمان کی طرف دیکھا ایک بڑا سا گہرا بھورا بادل بالکل ہاتھی جیسا لگ رہا تھا۔ بڈھا ہاتھی!

ایک دن تیج ناتھ نے منو کو سکھایا تھا۔ کریا بادل جی ڈرواوے، بھورا بادل پانی لاوے۔ منو نے تڑ سے سوال جڑا '' تیج ناتھ' تیج ناتھ' بادلوں کو کس نے بنایا؟''

''بھگوان جی نے بنایا ہوا اور کون بنائے گا؟ تب منو کے ذہن میں آیا کہ بھگوان جی ایک دھنکی لے کر بادلوں کو دھنک دھنک کر ہوا میں پھیلا رہے ہیں اور ان سے طرح طرح کی شکلیں بن رہی ہیں۔ وہ خاصے محظوظ ہوئے۔

کھیل چکے بھیا؟ منو کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تیج ناتھ نے امید افزا نظروں سے انہیں دیکھا ''آج چندر نہیں آیا تھا اس لئے آج تھوڑا سا ہی کھیلے۔ ابھی ہم گھر نہیں جائیں گے۔ ہمیں کہانی سناؤ تیج ناتھ'' منو بھیا جی کو کہانی سنانا انتہائی کٹھن کام تھا۔ اتنے سوال کرتے کہ سنانے والا کہانی ہی بھول جائے' تیج ناتھ نے آسان راستہ اختیار کرنا چاہا۔ ''گیت سنائیں بھیا؟''

''اچھا چلو' وہی سناؤ!''

''ارہر کی دال' جڑہن کا بھات۔ گاگل نیبوا' گھیو تات'' تیج ناتھ کان پر ہاتھ رکھ کر بڑے ترنم سے شروع ہوئے تھے لیکن اچانک رک گئے۔ بھیا جی اس کا مطلب ضرور پوچھیں گے۔ اب ان دونوں لائنوں کی بات تو ٹھیک ہے کہ ارہر کی دال ہو اور جڑہن کا خوشبودار چاول' ساتھ میں گاگل نیبو کا اچار اور گرم گرم گھی' مگر اس کے بعد کی لائنوں کا مطلب ذرا گڑبڑ ہو جاتا ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ اس الوہی کھانے کو کوئی خوبصورت آنکھوں والی عورت پیش کر رہی ہو تو اے گھاگھ یہ دنیا جنت ہے (تیج ناتھ کو تو حسین آنکھوں والی عورت بھی درکار نہیں تھی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے نقوش والی بیوی کافی تھی)۔

تیج ناتھ نے منہ میں بھر آئے پانی کو جلدی سے گٹکا اور منو کے بولنے سے قبل بول گئے۔ ''یہ چھوڑیئے بھیا جی' یہ ہمیں پورا یاد ہی نہیں رہا۔ آپ تو بس ایک بجھوّل بوجھئے۔'' انہوں نے قریب پڑی ایک چھوٹی سی ٹہنی اٹھائی اور ملائم مٹی میں اس سے ایک لکیر کھینچی' گہری' صاف لکیر۔

''بھیا جی!''

''ہاں تیجو ناتھو...'' منو کھلکھلا کر ہنسے ''ہم نے پھر تم میں او کی ماترا لگا دی'

''اب بھیا جی بجھوّل یہ ہے...'' انہوں نے او کی ماترا کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا'' کہ نہ تو آپ اسے کاٹیئے' نہ مٹایئے' مگر اسے چھوٹا کر دیجئے۔؟''

''اسی ریکھا کو...؟''

منو کا ہاتھ بے ساختہ لکیر کی طرف بڑھا کہ اس کا ایک حصہ مٹا دیں لیکن تیج ناتھ کی

ہائیں ہائیں سے سٹپٹا کر پیچھے کھینچ لیا گیا۔

''دیکھئے بھیا۔ ریکھا کو تو چھونا ہی نہیں ہے پتہ بھی ہے آپ کو۔ یہ بجھوّل راجہ بیربل نے اکبر بادشاہ سے بجھائی تھی اور اکبر بادشاہ ہار گئے۔''

''اکبر بادشاہ کون تھے تیج ناتھ؟''

''بھیا پہلے ریکھا چھوٹی کیجئے۔ اکبر بادشاہ بس بادشاہ تھے۔ ان کو پوچھ کر کیا کیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے تو ہم بھی ہار گئے۔ بتاؤ نہ تیجو ناتھو' بتاؤ نہ ریکھا چھوٹی کیسے ہوگئی؟''

تیج ناتھ نے اس لکیر کے نیچے اس سے بڑی ایک لکیر کھینچی اور فاتحانہ نظروں سے منو کی طرف دیکھا ''دیکھئے بھیا جی' اب یہ لکیر چھوٹی ہوگئی۔''

''آں۔ چھوٹی کہاں ہوئی''

''یہ لکیر جو ابھی کھینچی اس سے چھوٹی ہے کہ نہیں؟''

''ہے تو؟''

''تو بس ہوگئی چھوٹی''

منو تیج ناتھ کے گلے میں جھول گئے' کہاں ہوئی چھوٹی؟ وہ تھوڑی چھوٹی ہوئی۔ انہوں نے تیج ناتھ کی مونچھیں کھینچنے کی بھی کوشش کی۔

''ارے ارے' گرائیے گا کیا؟ سب کپڑا دھول کھا جائے گا' بادل ہے۔ دھوکر پھیلائیں گے تو سوکھے گا بھی نہیں۔ چلئے چلئے۔ گیر ہو رہا ہے۔''

''بتاؤ نہ تیج ناتھ' لکیر چھوٹی کیسے ہوگئی۔ وہ تو ویسی ہی ہے جیسی تھی۔'' چاروں زینے چڑھتے ہوئے منو بھیا جی تیج ناتھ کا دماغ چاٹ گئے۔

صاحب آچکے تھے۔ تیج ناتھ نے اپنا کرم خوردہ چھاتا اٹھایا' چرودھا جوتا پہنا' ہاتھ جوڑ کر میم صاحب کو پرنام کیا اور صاحب سے مخاطب ہو کر گویا' گڈ بائی ' کا مترادف دہرایا'' تب ہم چلے سر'' صاحب کم گو اور سنجیدہ انسان تھے لیکن اس وقت ہنس کر بولے'' ہم بھی چلے تیج ناتھ سر۔ آپ کے شہر سے ہمارا دانا پانی اٹھ گیا ہے۔''

راستہ تیج ناتھ پر بھاری ہو گیا اس کنبے کے ساتھ انکے خصوصی تعلقات بن گئے تھے وہ ڈیلی ویجز پر آفس میں رکھے گئے تھے صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ مستقل کرادیں گے۔ اس سلسلے میں

انہوں نے کچھ کوشش بھی کی تھی گرچہ ابھی کامیابی نہیں ملی تھی لیکن امید تھی کہ کچھ دن بعد تیج ناتھ مستقل ہو جائیں گے۔ بیٹھے بیٹھے وہ خواب دیکھا کرتے تھے۔ مستقل ہو گئے تو بیوی بچوں کو ساتھ رکھیں گے' لڑکا شہر میں پڑھے گا۔ گاؤں میں آئے دن خون خرابہ ہوتا رہتا تھا۔ وہاں کوئی کام بھی نہیں تھا کرنے کو جس سے مستقل آمدنی کی صورت ہوتی بس فصل کٹنے اور بونے کے وقت مزدوری سے کچھ پیسے ہاتھ آ جاتے تھے۔ اب کیا ہوگا بیوی سے کیا کہیں گے اس کو بھی بڑی امید دلا رکھی تھی۔ کریا بادل جی ڈرواوے... کریا بادل جی ڈرواوے... کہیں بجلی زور سے چمکی۔ تیج ناتھ نے دیکھا ان کے گاؤں میں برسات شباب پر ہے۔ ان کا کالا کلوٹا مریل سا منموہنا بیٹا ماں کے آنچل تلے چھپ رہا ہے۔ چھپر سے پانی ٹپک رہا ہے ٹپ ٹپ... اس کی مرمت کا ارادہ اب دھرا رہ جائے گا۔ بیٹی نے گلابی دھوتی لانے کے لئے کہا تھا لیکن اب تو آڑے وقتوں کے لئے چار پیسے بچا کر رکھنا ہی عقلمندی ہوگی۔ صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ پتہ نہیں دوسرا آدمی جوان کی جگہ پر آئے گا کیا کرے گا۔

تیج ناتھ کی امیدیں رنگ نہیں لاتی تھیں لیکن خدشے خوب پھلا پھولا کرتے تھے وہ مستقل کیا ہوتے' ڈیلی پر بھی نہیں رہ پائے عارضی ملازمین کی چھٹنی میں آ گئے۔ کئی مہینے شہر میں ہی پڑے رہ کر آفس کے چکر کاٹے۔ نئے صاحب کی خوشامد کی' کلرکوں کے آگے ہاتھ پیر جوڑے نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ پس انداز کی ہوئی رقم ختم ہونے کو آئی تو دل برداشتہ ہو کر گاؤں واپس چلے گئے۔ کٹائی کے موسم میں مزدوری ملی' فصل کاٹ رہے تھے تو منو بھیا جی بہت یاد آئے۔

''تیج ناتھ' گیہوں کہاں سے آتا ہے؟''

''کھیت سے بھیا جی''

''اور چاول؟''

''وہ بھی کھیت سے''

''کھیت میں کون بناتا ہے گیہوں اور چاول؟ اتنے سارے دانے' اتنے سارے دانے'' تیج ناتھ اس وقت گیہوں کا بورا کھول کر بیٹھے اناج پھٹک رہے تھے۔ منو نے اتنے سارے دانے کی تال پر بھر بھر مٹھی اناج ادھر ادھر بکھیرنا شروع کیا۔

''بھگوان جی بناتے ہیں بھیا جی' اور ان پھینکئے مت اسی کے چلتے آدمی کہاں کہاں مارا پھرتا

ہے۔'' تیج ناتھ کی زندگی کا واحد فلسفہ یہی تھا۔اس کا علم انہوں نے منو بھیا کے ساتھ بانٹا۔

بھگوان جی کے کارخانے لامتناہی تھے اور ان کی قوت بھی۔ وہ پاپا سے بھی کہیں زیادہ طاقتور تھے۔ وہ ہر جگہ پائے جاتے تھے اور سب کچھ کر سکتے تھے۔ضرور یہ سانپ کی طرح بل کھاتی اور نہ جانے کہاں کہاں تک پہنچتی سڑک بھی انہیں نے بنائی تھی اور بڑی بڑی اونچی عمارتیں اور دریا' دریا میں چلتی ناویں اور اسٹیمر' ریلوے لائن پر پٹریاں بھی انہوں نے ہی بچھائی ہوں گی اور ضرور مہیب' دیو قامت ریل گاڑی بھی انہیں کا کرشمہ ہے اور ممی کی ساڑی جو باریک دھاگوں سے بنی ہے اور جس پر اتنے باریک گھنے پھول اکیرے گئے ہیں۔اور تیج ناتھ' چاند سورج کس نے بنائے؟ وہ بھی بھگوان جی نے بنائے؟ سنی سے کاٹ کاٹ کے تھوک سے...نہیں گوند سے چپکا دیئے ہوں گے۔کرافٹ کے کلاس میں قینچی لے کر منو نے ٹیڑھے میڑھے ستارے کاٹے اور کاپی میں تھوک لگا کر چپکانے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ 'مس' نے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی تھی' گندے بچے! گوند سامنے رکھا ہوا ہے تب بھی...لو یہ پکڑو۔' بھگوان جی تو گندی حرکتیں کریں گے نہیں۔مگر اتنا گوند آیا کہاں سے ہوگا۔بھر بھر ڈرم وہ بھی خود بنالیا ہوگا انہوں نے۔

فصل کٹ چکی تو تیج ناتھ بھر بھر تسلہ گارا بنانے اور گٹی توڑنے کا کام کرنے لگے۔وہ پھر شہر آ گئے تھے۔اس بار بیوی کو بھی لے آئے تھے وہ بھی ساتھ میں مزدوری کرنے لگی تھی۔اس کے سر پر ایک بار میں چوبیس اینٹیں چُنی جاتیں۔انہیں لے کر وہ چلتی تو تیز ہوا میں لہراتے دھان کے پودوں کی طرح اس کی کمر لچکتی۔سارے دن کی جان لیوا محنت کے بعد اس کا جسم بھی دھان کے ان پودوں کی طرح ہو جاتا تھا جنہیں پیٹ پیٹ کر ان سے چاول علیحدہ کر لئے گئے ہوں اور بھوسی بچ گئی ہو۔

ڈیڑھ برس میں دس منزلہ عمارت کھڑی ہو گئی تھی ایک ایک اینٹ چن کر کھڑی کی گئی عمارت۔ایک ایک انچ پر پلاسٹر پھیر کر کھڑی کی گئی عمارت۔ایک ایک ٹائل ٹھوک کر سجائی گئی عمارت۔ایک ایک تار پرو کر روشن کی گئی عمارت (اس کے ایک حصے میں وائرنگ کرتا ہوا جوان ہٹا کٹا نریش چھٹی منزل سے گر کر مر گیا تھا۔عمارت اپنی جگہ تھی۔)

کچھ لوگ دنیا کی تعمیر کرتے ہیں اور کچھ اسے برتتے ہیں۔اٹھارہ لاکھ روپے دے کر اس عمارت کے فلیٹ خریدنے والے لوگ اب انہیں برتنے کے لئے آ آ کر بسنے لگے تھے۔کئی بچوں پر تیج ناتھ کو منو بھیا جی کا شبہ ہوتا تھا۔وہ سارے بچے ایک جیسے لگتے تھے۔ان کی شکلیں

الگ کر پانا تیج ناتھ کے لئے مشکل تھا جنکے کپڑے اور جوتے عمدہ ہوں، جسم صحت مند ہوں اور چہروں پر آسودگی اور بچپن۔ منو بھیا جی اب کچھ بڑے ہو گئے ہوں گے، آگے کی کسی جماعت میں پڑھتے ہوں گے۔ ابھی تو انہیں نہ جانے کتنا پڑھنا ہے۔ تیج ناتھ نے اپنے بیٹے کو ایک ایجنٹ کے سمجھانے پر مرزا پور بھیج دیا تھا۔ وہ وہاں قالین بنانا سیکھ کر قالین بنائے گا۔ دن رات اندھیرے کمرے میں قالینوں پر جھک کر وہ بیل بوٹے اکیرے گا۔ دنیا ان بیل بوٹوں کو دیکھ کر حیران ہوگی۔ مگر تیج ناتھ کے بیٹے کو اتنا ہی کھانا ملے گا کہ وہ زندہ رہ سکے۔ اتنا ہی کپڑا ملے گا کہ وہ اپنی لاج بچا سکے۔ قالین کے دھاگوں میں گرہیں لگاتے لگاتے اس کی انگلیاں زخمی ہوں گی لیکن وہ شاید کچھ پیسے بچا کر بھیج سکے گا جن کی تیج ناتھ کو سخت ضرورت تھی۔ اس لڑکے سے پہلے تیج ناتھ کی دو بیٹیاں تھیں جنہیں بیاہنا ضروری تھا۔ اس کے سماج میں سولہ سترہ سال کی بیٹی گھر میں نہیں بیٹھتی تھی، سسرال جاتی تھی۔ اس لئے قرض لے کر اس نے دونوں کو بیاہ دیا تھا۔

''تیج ناتھ، قالین کیسے بنا؟'' صاحب کے گھر نیا قالین آیا تھا تو نرم گدگدے قالین پر جس میں پیر دھنسیں، کودتے ہوئے منو بھیا نے پوچھا تھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا تھا ''بھگوان جی نے بنایا کیا؟''

''نہیں بوا، قالین تو آدمیوں نے بنایا، بیشک آدمی بھگوان جی نے بنائے۔''

''کون سے آدمیوں نے تیج ناتھ؟ ہم تو قالین نہیں بناتے، پاپا بھی نہیں بناتے پڑوس والے انکل، آنٹی بھی نہیں (یہ یقیناً کچھ اندیکھی، انجان، غیر مرئی طاقتوں کی کارفرمائی ہے۔ اس خیال کو منو بھیا الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکے تھے)۔

''ماتھا مت کھایئے بھیا جی۔ کبھی کبھی تو آپ ماتھا کھا جاتے ہیں'' تیج ناتھ زچ ہو جاتے تو یہی کہتے۔

فکر تیج ناتھ کو کھا رہی تھی۔ آٹھ دس مہینے ہو گئے تھے بیٹے کو گئے، نہ کوئی خیر خبر نہ پیسہ، وہ ایجنٹ غائب ہو گیا تھا۔ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا، دو چار مہینے اور گذر گئے۔ تیج ناتھ اب ریلوے لائن کی مرمت کرنے والے مزدوروں میں بھرتی ہو گئے تھے۔ کسی نے بتایا کہ مرزا پور کے ایک قالین بنانے والے کارخانے سے کچھ کم عمر لڑکے بھاگ نکلے تھے۔ تیج ناتھ نے سوچا اس کا بیٹا بھاگنے والوں میں نہیں ہو سکتا۔ اتنا چھوٹا اور سیدھا ہے کہ اس کی ہمت نہیں کر سکتا، گھر کا پتہ ٹھکانہ بھی

صحیح نہ معلوم ہوگا۔ ضرور وہ دوسرے لڑکے رہے ہوں گے۔

تیج ناتھ کا ایک خیال غلط تھا' اس لئے کہ اس کے لڑکے نے بھاگنے کی ہمت کی تھی۔ تیج ناتھ کا دوسرا خیال صحیح تھا۔ لڑکا از حد سیدھا بلکہ بے وقوف تھا اسے گھر کا پتہ ٹھکانہ بھی نہیں معلوم تھا اس لئے وہ ایک دوسرے شہر کے سرکاری ہسپتال کے مردہ خانہ میں پہنچ گیا۔ ہاں ٹرین کی چھت پر سفر کرنے والے لوگوں میں سے ٹرین کے ایک سرنگ سے گذرنے پر جو لڑکے مرے ان میں جن کی شناخت ہوگئی تھی وہ ان میں سے ایک تھا۔

گھٹنوں میں منہ دے کر بلک بلک کر روتے ہوئے تیج ناتھ کو وہ ایجنٹ دیر سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیج ناتھ نے ضرور پچھلے جنم میں کچھ اچھے کام کئے تھے۔

''تم یہ تو سوچو کہ تمہیں لاش مل گئی اپنے ہاتھ سے کریا کرم کیا۔ باقی کئی لوگوں کو تو ان کے بچے ملے بھی نہیں' کون کہاں ہے؟ جیا کہ مرا؟ تمہاری آنکھیں بھی ساری زندگی دروازے پر لگی رہتیں۔ وہ بے یقینی کیا اس یقین سے زیادہ جان لیوا نہ ہوتی؟''

تیج ناتھ پتھر کی طرح بیٹھا سنتا رہا۔

ایجنٹ کے ضمیر پر شاید بوجھ سچ مچ تھا۔ اس نے دوبارہ بات کا سرا پکڑا۔

''بتھانی ٹولہ اور میاں پور کے لوگوں سے پوچھو۔ راتوں رات اجڑ گئے' پورے کنبے بھون دیئے گئے لیکن جو کوئی بچ گیا وہ سوچتا رہا کہ مر جاتا تو ہی بہتر تھا۔ ننھے بچے ماؤں کے سامنے مارے گئے اور بچوں کے سامنے ان کے ماں باپ۔ دنیا میں دکھ بہت ہے تیج ناتھ ہم نے تو چاہا تھا کہ تمہارے بیٹے کو روزگار سے لگا کر ہم تمہاری مدد کریں مگر کیا کریں۔ ہم بھی کلجگ میں جی رہے ہیں کون ہے جو دکھی نہیں ہے۔''

پتھر میں اچانک جنبش ہوئی۔ بے روح آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ تیج ناتھ نے اندر تک اتر جانے والی ایک تیز دھار دار نظر تسلی دینے والے پر ڈالی۔

''ہمارے دکھ کی ریکھا کے نیچے اس سے بڑی ریکھا کھینچ کر اسے چھوٹا مت ٹھہرایئے صاحب۔ وہ لکیر چھوٹی نہیں ہوگی وہ تو وہی رہے گی جو وہ ہے۔''

منو بھیا جی نے یہی تو کہا تھا اور بچے بھگوان کا روپ ہوتے ہیں۔

دھوتی کا چھور آنکھوں پر رکھ کر وہ پھر بلکنے لگا تھا۔

گلی سرمست میں رمضان

مغرب میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔

حافظ مسیتا عرف حاپجی نے جلدی جلدی مسالہ ملے قیمے کو آٹے کی طرح گوندھنا اور سیخوں پر لگانا شروع کیا۔ دوکان پر کام کرنے والا لڑکا مغلی پنکھے سے انگیٹھی کے کوئلے دہکانے میں مصروف تھا۔ انگیٹھی کے دوسرے مونہہ پر المونیم کا بڑا سا چائے دان چڑھ چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ آنے لگیں گے۔ ایسے نہ جانے کتنے ہیں جن کا گھر دوار نہیں ہے۔ سب افطار کے وقت حاپجی کی دکان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں، روٹی، کباب چائے اور پکوڑوں سے روزہ کھولتے ہیں۔ چنے جو عام دنوں کے مینو میں شامل نہیں ہیں، رمضان میں خصوصی اہتمام کے طور پر ملنے لگتے ہیں۔

''جلدی کر بیٹا'' حافظ جی نے لڑکے سے کہا ''جاڑوں میں سورج سرسے ڈوبتا ہے، گرمی میں تو جیسے اس کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔ ڈوب کے ای نئیں دیتا۔''

''ساما لیکم حاپج چا۔ ساما لیکم بھائی مغلی'' یہ اکبر تھا وقت سے کچھ پہلے ہی چلا آیا تھا۔ ''پڑھ پڑھ کے سالا دماغ خراب ہو گیا۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا اور انگیٹھی کے سامنے ہاتھ کر کے ہاتھ تاپے۔ ''لکھ لکھ کے انگلیاں اکڑ گئیں۔''

ابھی اور لوگ نہیں آئے تھے اس لئے اس نے آرام سے پاؤں پھیلائے اور پیر اوپر چڑھا کر بیٹھ گیا۔ اکبر سامنے والی لاج کے لڑکوں میں سے تھا۔ چار پانچ کمروں میں کوئی سولہ سترہ لڑکے

گھسے ہوئے تھے سب کے سب قریب کے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ میں انجینئر نگ یا میڈیکل کالجوں میں داخلے کے امتحانات کی پڑھائی کر رہے تھے۔ گلی سرمست کے کئی لوگوں نے اپنے گھر کو لاج میں تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ کھانا بھی مہیا کراتے تھے۔ کچھ نے محض رہنے کی سہولت دی ہوئی تھی۔ سب کے سب نہایت مہنگے۔ اماں ابا بھگتتے رہتے تھے۔ لڑکا میڈیکل یا انجینئر نگ کالج میں آ گیا تو وارے نیارے ہیں۔ سمدھی سے مع سود سارا خرچ اگلوا لیں گے۔ نہ آیا تو بھی دیکھا جائے گا جب تک امید ہے تب تک تو خوش ہو لیں۔ ویسے دنیا اب پہلے سے بہت زیادہ وسیع ہو چکی ہے ناقص پرزے بھی کہیں نہ کہیں فٹ ہو ہی جاتے ہیں۔

شاہ سرمست لاج میں آبادی کا تناسب ذرا گڑبڑا گیا تھا۔ اقلیت' اکثریت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ غیر مسلم لڑکے بدرجہ مجبوری ہی یہاں آتے۔ جو آتے تھے انہیں کوچنگ کے ساتھی چھیڑتے:
''ان سے ملئے' یہ پاکستان میں رہتے ہیں۔'' ''کیوں جی' میاں بننے میں کتنی دیر ہے؟'' ''اماں تمہیں دیکھا تھا ایک دن مسجد سے نکل رہے تھے۔''

یہ مسجد والی بات ذرا بے ڈھب تھی۔ جس سے کہی گئی تھی وہ لڑکا گھبرا گیا۔ دراصل وہ اپنے ایک ساتھی کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ ساتھی دو دن سے غیر حاضر تھا اور اس کے نوٹس مانگ کر لے گیا تھا۔ اس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے لئے باقاعدگی سے مسجد آتا ہے۔ یہ اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ یار لوگ غضب کی خبر رکھتے ہیں۔ ڈر گیا کہ کہیں اماں ابا تک بات پہنچ گئی تو کباڑا ہو جائے گا۔ شاہ سرمست کی لاج سے وہ پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ لڑکا کچھ ہی دنوں میں کہیں اور منتقل ہو گیا۔ بڑی مشقت کے بعد ایک جگہ تلاش کر سکا تھا جہاں پئینگ گیسٹ بن کر رہ سکے۔

''آ جا بے' تو بھی آ جا'' اکبر نے قیصر کو بالکونی سے جھانکتا دیکھ کر ہانک لگائی۔ قیصر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''یار آج صبح سے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ پیاس بھی بہت لگی۔ اتنی ٹھنڈ ہے پھر بھی۔ حاجی کے کباب پراٹھے کھا کھا کے اور ہو گا بھی کیا۔''

دراصل رمضان میں ہی نہیں' عام دنوں میں بھی یہ لڑکے زیادہ تر حافظ مسیتا کے کباب پراٹھوں پر گذارا کرتے تھے۔ چھ روپیوں میں پیٹ بھر جایا کرتا تھا۔ خوب تیز مسالوں والے کباب اور

ہرے دھنیے کی کھٹی چٹنی۔

شاہ سرمست میں کھانا نہیں مہیا کرایا جاتا تھا۔لڑکے ایک آدھ وقت چائے ڈبل روٹی پر گذارا کر لیتے، کبھی اسٹوو پر کھچڑی ابال لیتے۔پھر دوسرے وقت کوئی اوپر سے چلاتا۔ارے حاجی چا...او بھائی مغلی۔اماں لپک کے لے آئیو تو کباب پراٹھے... ہاں میں' سب کے لئے... ہم کیا اکیلے کھائیں گے...اور ہاں گھاس خوروں سے پوچھ لیجیو انہیں کیا چاہئے...وہ بھی لے آئیو...دور سے مغیث حیدر عرف مغلی کی ٹھی ٹھی اور حافظ مستیا کی ڈانٹ سنائی دیتی۔

ابھئے نیا نیا آیا تھا۔کباب دیکھ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔اکبر کی پلیٹ پر لپکا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر پلیٹ پیچھے کر لی "ابے، بڑے کے ہیں۔پرے ہٹ"

"گو مانس!" گھن، نفرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت اس کے چہرے کو مسخ کر گئی۔فوری طور پر وہ خود اپنا ردعمل سمجھ نہیں پایا۔

"ابے ہے تو یہ بھینس مانس۔مگر تُو تو بھینس بھی نہیں کھائے گا۔گائے ماتا تو بھینس کم از کم موسی تو لگی۔وہ بھی نہیں تو پھوا میں کیا شک۔" ابھئے ایکدم سے ہنس پڑا۔گرچہ اس کا غصہ رفع نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اکبر کی ایمانداری کی قدر کی۔

"کباب پہ لپکے تھے۔اس کا مطلب ہے گوشت کھاتے ہو؟"

"اماں گوشت تو ہم ایسا کھاتے ہیں کہ ہمارے کھانے کے بعد کتے کے لئے ہڈی نہ بچے مگر ہاں......" اس نے سر کھجایا۔

"وہ بھی کھانے لگو گے۔" دانش نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔"جب چھ روپے میں بھر پیٹ کباب پراٹھے ملیں گے۔دھرم طاق پر رکھ کے یہاں کئی رکشے والے......"

"دانش!" اکبر نے بڑی زور سے دانش کو ڈانٹا۔وہ باقی لڑکوں سے عمر میں کچھ بڑا اور مزاجاً سنجیدہ تھا۔

"ابے نیچے اتر! وہاں کیا کر رہا ہے؟" قیصر نے ابھئے کو بھی بالکونی میں نمودار ہوتے دیکھا تو اس بار اس نے ہانک لگائی۔

"آجا' آجا۔روزہ نہیں رکھتا تو نہ رکھ۔شام کی چائے تو پئے گا نہ۔چل آج افطار ہماری طرف سے۔" دو لڑکے اور چلائے۔

ابھئے اور انجنی دونوں آ گئے۔ جب سے رمضان شروع ہوا تھا یہ دونوں نئے نئے مناظر سے دو چار ہو رہے تھے۔ شروع میں گھبراہٹ بھی ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے بہت سارے مسلمان بلبلاتے ہوئے نکل پڑتے تھے۔ سر پر کروشیا سے بنی ہوئی ٹوپیاں' لانبے لانبے کرتے۔ مسجد میں اذان ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے سینی میں افطاری لئے ہوئے مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ ان کی سینیوں پر بھی اکثر کروشیا سے بنے ہوئے خوان پوش پڑے ہوتے۔ دوپٹوں سے سر ڈھکے' سر جھکائے وہ لڑکیاں بڑی پیاری لگتیں۔ پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون شاہ سرمست لاج میں رہنے والے لڑکوں پر بڑا ترس کھاتیں ''ہا' بے چارے گھر سے دور رمضان میں روزے رکھ رہے ہیں۔'' کبھی کبھی وہ مسجد کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں بھی سینی بھجوادیتیں۔ ابھئے اور انجنی کے بھی چھکے پنجے ہو جاتے۔ ایک دن انجنی نے کہا'' ذرا تفتیش کرلی جائے۔ یہ شاید ''فیوچر انوسٹمنٹ'' ہے گھر میں کوئی تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہوگی۔ کچھ سالوں بعد ڈاکٹر یا انجینئر...'' دانش بگڑ گیا۔ ''ابے یہ ہمارے یہاں کا دستور ہے۔ مسجد میں کون سے ڈاکٹر یا انجینئر پکڑنے کو افطاری بھیجی جاتی ہے۔''

''تو حرج کیا ہے؟'' ابھئے نے انجنی کا ساتھ دیا' برا کیوں مان رہے ہو؟''

''سالے تم دونوں پٹ جاؤ گے'' دانش نے آنکھیں نکالیں

''ہاں اقلیت میں ہیں۔ اقلیت ہمیشہ سے پٹتی چلی آ رہی ہے۔''

''بہت بڑا فلسفہ بگھارا تم نے تو۔'' دانش نے اس بار سالے سے دو چار ڈگری آگے کی گالی جوڑی

''رمضان میں زبان نہیں خراب کرتے۔ خبردار جو گالی بکی ہے۔'' اکبر نے دانش کو ڈپٹا۔

''بھیا جی'' قیصر کہہ رہا تھا۔ ''ایک دن روزہ رکھ کے کھاؤ پھر مزا دیکھو پکوڑوں کا... اس سے تو خیر تم محروم ہو' اس نے شرارت سے سیخوں کی طرف اشارہ کیا۔

ابھئے اور انجنی کو رمضان کے شروع میں سحری کے اعلان اور پھر فجر کی نماز کے بعد میلاد سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ''یار تم لوگ اپنے ساتھ یہ دوسروں کی نیند کیوں حرام کرتے ہو؟'' ایک دن چڑ کے کوئی بولا تھا۔

''لالہ ہردیال تو باقاعدہ اس کے خلاف مہم چلا چکے ہیں تو بھی چلا لے۔'' بولنے والا خاموش ہو گیا۔

قیصر کے ہونٹ کچھ کہنے کو پھڑ کے۔ اسے خود ہی سخت کوفت ہوتی تھی۔ سحری کھانے کے لئے اٹھنا وہ بھی جاڑوں میں۔ اسے نیند سے زیادہ کچھ عزیز نہیں تھا۔ واقعی ان کے نقطہ نظر سے سوچو جن کے نزدیک اس میں کوئی مذہبی رنگ نہیں ہے۔ ہوسٹل میں دو چار ملاّ تھے وہ قیصر کی گردن دبا دیں گے۔ اس لئے اس نے زبان بند رکھنے میں عافیت سمجھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ وہ جو معقول سوچ رکھتے ہیں اپنی زبان بند رکھنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ دکان پر جمگھٹ لگ چکا تھا۔ کسی نے ایک گھونٹ پانی سے روزہ کھولا۔ کچھ نے جیب سے کھجوریں نکالیں۔ ایک شخص نے ایک کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا اجنبی کو بڑھا دیا۔ ہم روزہ دار نہیں ہیں۔ کہتے کہتے وہ رک گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں کھجوریوں لی جیسے وہ پرشاد لیا کرتا تھا' پھر ماتھے سے لگا کے قیصر کو بڑھا دی۔ اس شخص نے قدرے حیرت کے ساتھ اجنبی کو دیکھا۔

افطار کے بعد لڑکوں نے ٹوپیاں سنبھالیں۔ حافظ جی نے بھی۔ مغلی نے حسب عادت ٹوکا

''جلدی آ جائیو حاچچا''

''ابے الو کے' ہم دیر لگاتے ہیں کبھی؟ روز ٹو کے بغیر نہیں مانے گا۔''

''ہیں ہیں... چچا' ہم سے اکیلے نہیں بیٹھا جاتا۔ پھر ہمیں بھی تو نماز پڑھنی ہے''

''چپ بے' دکان دیکھ۔''

حافظ مسیتا کو معلوم تھا مغلی کبھی نماز نہیں پڑھتا۔ اسے پڑھنی آتی بھی نہیں۔ البتہ عید کے دن عید گاہ ضرور جاتا ہے اور جیسے جیسے لوگ رکوع اور سجدے میں جاتے ہیں وہ بھی نقل کرتا جاتا ہے۔ دعائیں البتہ بہت سی مانگتا ہے۔ اپنی' خود کی چائے کی دکان، اماں کی آنکھیں' بہن کی شادی' ایک چھوٹا سا گھر' اس گھر میں پائل چھنکاتی بیوی' لڑتے جھگڑتے' شور مچاتے بچے اور بھی بہت کچھ الم غلم۔ ساتھ ساتھ جو اسے برے لگیں' یعنی ایسے لوگ جنہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو' ان کے لئے اللہ میاں سے حسب توفیق ان کا برا کرنے کی بھی دعا گھسیٹ دیتا۔ ایک مرتبہ حافظ جی نے دودھ ابالنے میں غفلت برتنے پر اسے چپتیا دیا تھا۔ اتفاق سے یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا عید کی نماز میں اس نے دعا مانگی ''اللہ میاں اس حرامزادے حاچچا کی تو ٹانگ ہی توڑ دیجیو'' لیکن نماز سے واپس آ کر حافظ جی نے اسے دس روپے عیدی دی تو اس نے فی الفور اپنی بد دعا نہ صرف

واپس لے لی بلکہ ان کے لئے گالی استعمال کرنے کے لئے اللہ میاں سے معافی بھی مانگی۔
رمضان میں افطار کی گہما گہمی کے بعد پھر عشا اور تراویح کے بعد تک عموما بزنس مندا رہتا تھا اس لئے وہ دونوں گھٹنوں پر سر رکھ کے اونگھنے لگا۔
''ارے بھائی موگلی!''
مغلی اچھل پڑا۔ آواز کراری اور اختیار آمیز تھی۔ آنکھیں ترچھی کر کے دیکھا تو لالہ ہردیال تھے۔ گلی کے اختتام پر جہاں سے چوڑی سڑک شروع ہوتی تھی وہیں نکڑ پر ان کا دومنزلہ مکان تھا نچلے حصہ میں مٹھائی کی شیشوں سے مزین فیشن ایبل دوکان اور اوپر رہائش گاہ۔
''بابو جی آپ؟'' حیرت سے مغلی کا مونہہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایسی بات نہیں کہ لالہ جی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سلام پر نام اور تُو تُو میں میں دونوں کا رشتہ تھا۔ لیکن تھا دور دور کا۔ دوکان پر تو وہ صرف ایک مرتبہ اور آئے تھے' تصدیق کرنے کے لئے کہ ان کا لڑکا یہاں بیٹھ کر کباب کھا کے تو نہیں گیا ہے۔
''ہاں ہم! نہ آئیں تمہاری دوکان پر کیا؟ اچھوت سمجھتے ہو؟'' مغلی اور زیادہ گڑ بڑا گیا۔ خیریت ہوئی نماز پڑھ کے واپس آتے حاجی دکھائی پڑ گئے اس کی جان میں جان آئی۔
''سلام لالہ جی' آپ؟'' حافظ مسیتا بھی گھبرا گئے۔
''کیوں بھائی' ہم پڑوسی نہیں ہیں کیا؟ ہم نے تو سوچا ہے کہ گلی سرمست کے سب مسلمان بھائیوں کو افطار کی دعوت دیں۔ آخر ہم لوگ ایک جگہ رہتے ہیں' دکھ سکھ کے ساتھی ہیں''۔
''مگر بابو جی آپ کو یہ سب ابھی کیسے یاد آیا'' مغلی بولنے ہی والا تھا کہ حاجی نے آنکھ کے اشارے سے تنبیہہ کی۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں ہردیال جی۔ ہم سب آئیں گے۔ کب کرا رہے ہیں فطار؟''
''اب کی جمعہ کو رکھیں۔ پکوڑے آپ ہی سے چھنوائیں گے۔ اور ہاں چنے بھی آپ کے ذمے۔ باقی حلوائی بٹھالیں گے۔'' وہ دیر تک کھڑے جزئیات طئے کرتے رہے۔ مدعوئین کی فہرست بھی بن گئی تاکہ کوئی چھوٹے نہیں۔
''وہ مشرواسچ کہہ رہا تھا۔ لالہ ہردیال اس بار میونسپل کارپوریشن کے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اکبر کو دعوت ملی تو اس نے برجستہ کہا'' جیت گئے تو صرف بھنگیوں کی بحالی میں ہی

اچھا خاصہ کما لیں گے۔ رعب داب رہے گا وہ الگ۔''

''تم سالے سب کو شک کی نظروں سے ہی دیکھتے ہو۔'' قیصر نے پڑھتے پڑھتے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ ''ایک دن اچھا افطار مل جائے گا۔ بے چارہ مغلی دن رات محنت کرتا ہے اس کا گھر یہاں ہے پھر بھی دکان پر زندگی بسر ہو رہی ہے۔''

''مغلی کون سا روزہ دار ہے۔ خواہ مخواہ ترس کھا رہے ہو۔'' دانش جھنجھلایا دیر سے فزکس کے ایک سوال الجھا ہوا تھا جو بن ہی نہیں رہا تھا۔

مغلی کا اپنا ایک الگ فلسفہ تھا۔ اللہ میاں نے ویسے ہی ہمیں کھانے کو کم دیا ہے اس لئے روزہ ہم پر فرض نہیں ہے۔ ہم بغیر روزہ رکھے جانتے ہیں کہ بھوکا رہنے پر کیسا لگتا ہے۔ رزاق رکشے والا مغلی کا ہم نوا تھا۔ رات کو گرم دودھ اور لچھوں کی سحری کھاتا کہ گلی رمضان میں رات بھر جاگتی تھی۔ لانبی نوکیلی مونچھوں سے دودھ چاٹ کر صبح کو روزے کی نیت کرتا لیکن اگر سویرے رفع حاجت کو چلا جاتا تو روزہ توڑ دیتا تھا یا یوں کہئے کہ نہیں رکھتا تھا ''اب بھیا پیٹ خالی ہو گیا تو بڑے زور کی بھوک لگتی ہے پھر ہم سے رکشا نہیں کھنچتا۔ ایک سے ایک موٹی موٹی سواریاں چڑھ جاتی ہیں۔ ایک دن تو ڈاکٹر صاحب کی بی بی چڑھیں۔ ایک ماما' ایک چھوکری' ایک کوئنٹل کی خود، بیس کیلو پھل' پانچ کیلو مرغا' ڈھائی کیلو سوئیں۔ کتنا کھاتے ہیں یہ لوگ رمضان میں۔ محلے داری ہے منع بھی نہیں کر سکے کہ اتنا سامان اور دو دو نوکرانیاں نہ چڑھائیں۔ پست ہو کے پڑ گئے۔ روزہ توڑنا پڑا۔'' لیکن گلی میں پھل والا اشرف' ماسٹر ساجد علی' غلام علی باربر' اشرف کا بھائی مشرف' زبیر میوے والا' سب کے سب پکے روزہ دار تھے۔ رکشہ اسٹینڈ کے چار مسلمان رکشے والے بھی پابندی سے روزہ رکھتے تھے۔ رزاق ان سب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ''اے بھیا' جنت میں زیادہ جگہ ملے گی تمہیں۔ تھوڑی ہم لے لیں گے۔'' حنیف گھوم گھوم کے سلائی مشین کی مرمت کرتا پھرتا۔ آوازیں بھی لگاتا جاتا ''سلائی مشین مرمت!'' لیکن کیا مجال جو روزہ قضا ہو۔

''ہردیال چاچا جس دن افطار پارٹی دیں گے' اسی دن ہم بھی روزہ رکھیں گے'' ابھئے نے اعلان کیا۔

''ابے کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرائے گا۔ ویسے بھی روزہ رکھ یا مت رکھ جائے گا تو جہنم میں ہی۔'' دانش نے اس کا منھ چڑھایا۔

''ہی ہی ہی...... سب اچھے لوگ وہیں ہوں گے۔تم رہیو داڑھی والے وقوف امام صاحب کے ساتھ۔ مائک پر پڑھ رہے تھے وہ کیا کہیں کہ خطبہ۔ترکیب بتا رہے تھے کہ بیوی کو کیسے ماریں کہ چہرے پر نشان نہ پڑیں'' دانش کھسیانا ہوگیا۔ابھئے اور چندن نے اس رات ڈھول دھپے' شور شرابے کے ساتھ سحری کھائی اور دوسرے روز روزہ رکھا''اب سالے کہیں مسجد میں نماز پڑھنے مت آجائیو۔'' اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔''لالہ ہردیال افطار پارٹی تو دے دیں گے لیکن اس کے بعد ایک عدد فساد کرا ڈالیں گے۔امتحان قریب ہیں سب بن جاؤ گے ڈاکٹر انجینئر۔'' ابھئے نے منھ اٹھا کے جواب دیا' ہی ہی ہی۔

اسی جمعہ کو رکشہ اسٹینڈ کے رکشے والوں نے چاروں مسلمان رکشہ والوں کے لئے افطار کا اہتمام کیا۔اس دن شرما حضوری رزاق نے بھی پورا روزہ رکھ لیا۔ بیج ناتھ گھر سے بہت سے پکوڑے بنوا کے لایا' لکھن نے کھیر رکھی۔شرما نے پھل اور پاسوان نے حاجی کے یہاں سے گھوگھنی خریدی۔شام کو جگہ صاف کر کے ان سب نے پرانے اخبار بچھائے جو وہ ردی بیچنے والے بڑھئو سے مانگ لائے تھے (بڑھئو کا کوئی نام نہیں تھا وہ صرف بڑھئو کہلاتے تھے۔اللہ جانے پیدا ہی بوڑھے ہوئے تھے یا کبھی کوئی اور نام بھی تھا۔)

بیج ناتھ نے کہا' نمک کا بھگوان مالک ہے۔گھر والی بولی ہے کہ بھگوان جی کا پرساد چکھا نہیں جاتا اس لئے بیسن گھولتے وقت نمک نہیں چکھا ہے۔

اذان ہوئی تو سر پر گمچھے باندھ کے سب گھیرا بنا کے بیٹھ گئے۔''اس سے اچھے پکوڑے ہم نے پہلے نہیں کھائے''۔نور محمد نے کہا۔ان کی آواز میں ہلکی سی نمی تھی۔اچانک سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔سرمست لاج کے سارے کے سارے اٹھارہ لونڈے ہاتھ میں افطار کی پلیٹیں اٹھائے وہیں چلے آرہے تھے۔چندن کے ہاتھ میں چٹائی بھی تھی۔سب وہیں پھیل کے بیٹھ گئے۔''چلو مومنو اللھم لک صمت۔ابے جلدی افطار کرا بھئے۔'' معلوم ہوا کہ اس افطار کی خبر اکبر نے دی تھی۔صبح وہ رزاق کے رکشے سے کہیں نکلا تھا اسے رزاق نے بتایا تھا۔لڑکوں نے ایکٹوٹی یہ کی کہ افطار لالہ ہردیال کے یہاں سے اٹھایا اور یہاں آن پہنچے۔اس دن وہ مسجد نہیں گئے، وہیں چٹائی بچھائی اور نماز ادا کی۔میاں نور محمد نے کہ ان کی داڑھی بھی تھی اور عمر دراز تھے' امامت کی۔

رمضان کا ایک اور دن تمام ہوا۔

☆☆

محمود و ایاز

لانبی سی نئی گاڑی کو کافی آگے بڑھا کر سڑک کے کنارے لگے اس پرانے جغادری پیپل کے نیچے لگاتے وقت گردھر مانجھی نے مسجد کے صحن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ یہ نظارہ کوئی نیا نہیں تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے وہ 'صاحب' کو تقریباً باقاعدگی سے مسجد لایا کرتا تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی بحث تکرار نہیں، جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں کھڑا ہو گیا۔ صفیں خود بخود آراستہ ہو گئیں۔ زیادہ تر لوگ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ہوتے۔ وہ ایک ساتھ جھکتے' سجدہ ریز ہوتے' پھر اٹھ جاتے۔ گردھر بے حد متاثر ہوتا۔ اکثر اتنی بھیڑ ہو جاتی تھی کہ نمازی سڑک پر آ جاتے تھے۔ پرانے پیپل کے بے حد قریب جس کے نیچے ایک چبوترہ بنا کر سندور پُتی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور جس کے موٹے تنے کے گرد عورتوں نے اپنے شوہروں کی طویل عمر اور اولاد کی خواہش کے لئے گہرے نارنجی رنگ کا موٹا سوت لپیٹ رکھا تھا۔ پیپل سے فوراً پہلے ایک خستہ حال مکان تھا۔ خستہ حال اور بہت ہی کم چوڑائی میں بنا۔ اس کم چوڑائی میں بھی دروازے سے لگا کر مالک مکان' شنکر بابو نے ایک دوکان نکال دی تھی۔ ٹائر میں ہوا بھرنے والا لطیف سکڑ سمٹ کر بمشکل تمام اس میں آ پاتا تھا۔ اس میں اس نے ویلڈنگ کی مشین اور کچھ اور انگڑ کھنگڑ بھر رکھا تھا جو پنکچر بنانے میں کام آتا تھا۔ دوکان سے

باہر زمین پر پرانے ٹائر بکھرے رہتے تھے جنہیں رات کو گھر جانے سے پہلے لطیف اٹھا کر تلے اوپر کر کے اندر ڈال دیتا اور ایک زنگ آلود تالا لگا کر اس سے بھی زیادہ زنگ آلود کھڑکھڑاتی سائیکل پر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ گردھر اس کا منہ چڑھا شناسا تھا گرچہ دونوں کے تعلقات جمعے کے جمعے ہونے والی اس مختصر سی ملاقات سے زیادہ نہیں تھے۔ لطیف اکثر نماز میں غچہ دے دیا کرتا تھا۔

گردھر محسوس کرتا کہ وہ اٹھنے والا نہیں ہے تو ٹوک دیتا۔

''کا ہو آج پھر نہ جیہو کا؟'' کھڑی بولی روانی سے بولنے والا گردھر کبھی کبھی اپنی مادری زبان پر اتر آتا۔

''نہیں یار۔ ایم ایل اے صاحب کی گاڑی ہے۔ بیٹری کا بھٹہ بیٹھا ہوا ہے۔ جلدی بنا کے دینی ہے ان کا مچھیش باڈی گارڈ آ کے دھمکا گیا ہے کہ چار بجے تک دے دو۔ ایک ٹائر میں پنکچر بھی بنانے کو ہے۔''

''تمھرے اللہ میاں ناراج نہ ہوئہیں؟ اچھا بیٹا جاؤ جلو آگ ماں۔'' اس کے لہجے میں شرارت ہوتی۔

''ارے تجھے کیا۔ اللہ میاں نے کیا تجھے بھیج دیا ہے لگان اگاہنے کو۔ وہاں کی وہاں دیکھی جائے گی۔'' اس نے مکھی اڑانے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ پھر قدرے غصے سے بڑبڑایا۔ ''چھت ٹپک رہی ہے۔ برسات آنے کو ہے۔ پورے پندرہ سو کا نسخہ بتایا ہے راج مستری نے۔''

گردھر نماز کے لئے ٹوکتا تو لطیف کو کچھ زیادہ ہی شرمندگی ہوتی تھی۔ شرمندہ ہوتا تو جھنجھلاتا۔ مولوی صاحب تو تھے ہی ڈرانے اور گناہ کا احساس پیدا کرنے کے لئے۔ ایک مرتبہ خطبے میں بتا رہے تھے کہ نماز قضا کرنے سے زیادہ بڑا کوئی گناہ تو ہے ہی نہیں۔ جہنم کے کندوں کی روشن آگ میں جل جل کر گنہگاروں کی کھال جب جھڑنے لگے گی تو اللہ میاں نئی کھال بنائیں گے اور اسے پھر سے جلائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ پھر کہیں جا کر کبھی روز قیامت جب اللہ کے رسول کی شفاعت نصیب ہوگی تب نجات ملے گی۔

''قیامت کب ہوگی؟ عذاب کا یہ لامتناہی سلسلہ کے سو سالوں تک چلے گا؟ اللہ میاں کو اور کوئی کام نہیں ہے؟ دنیا کی حالت کیسی خراب ہو رہی ہے۔ بنا کے بھول گئے۔ ذرا اسے بھی دیکھیں۔'' وہ جل کے بدبدایا تھا۔

لطیف کو معلوم تھا۔ ذرا سی کھال تھوڑی سی دیر کو بھی جل جائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

وہ اکثر داتا پیر کی درگاہ پر حاضری دینے جایا کرتا تھا۔ عرس یا کسی نیاز فاتحہ کے موقع پر وہاں بہت سا کام بھی کرا دیتا۔ وہاں گیارہویں شریف کے موقع پر سالن کا بڑا سا دیغ اتارتے ہوئے اس کا ہاتھ بہکا اور کھولتے ہوئے شوربے کی اچھی خاصی مقدار اس کے ہاتھ اور بازو کو جلاتی ہوئی نیچے گری۔ وہ تکلیف آج تک نہیں بھولا تھا لطیف۔ درگاہ پر اتنی خدمت کرتا تھا پھر بھی ادھر اس کی آمدنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اغل بغل کئی چھوکرے پمپ لے کر بیٹھنے لگے تھے۔ گرچہ وہ تو پنکچر بناتا تھا اور بیٹری کا بھی کام کرتا تھا پھر بھی اس کی آمدنی کا اچھا خاصہ حصہ وہ لونڈے اٹھا رہے تھے۔

آج بھی اس کا قطعی موڈ نہیں تھا کہ وہ نماز پڑھنے کے لئے اٹھے۔ مگر وہ آن موجود ہوا' وہی کم بخت گردھر۔ محمود علی صاحب کی گاڑی دور سے ہی آتی دکھائی دے گئی تھی۔ ویسے کبھی کبھی وہ بھی ناغہ کر لیتے تھے یا وہیں کچہری میں ظہر پڑھ لیتے۔ لیکن جس دن ایسا ہوتا لطیف کو گردھر سے نہ مل پانے کی خلش بے چین کرتی۔

گردھر نے مسجد کے پاس آ کر رفتار کم کی' بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے ہاتھ کر کے دروازہ کھول کر محمود صاحب کو اتارا۔ پھر گاڑی آگے بڑھاتا سیدھے لطیف کی دکان کے پاس آ گیا۔

''ابے جا رہا ہوں' جا رہا ہوں' ابھی ذرا سا وقت ہے۔ آ ادھر بیٹھ۔ چائے والا چھوکرا لاتا ہی ہوگا۔'' وہ گردھر کو شیشہ گرا کر منہ نکالتے دیکھ جلدی جلدی بولنے لگا۔ محمود صاحب آج واقعی ذرا پہلے آ گئے تھے۔

''جا' یا مت جا۔ ہمیں کیا۔ اللہ میاں سے تو ہی نپٹ لیجیو۔'' چائے سڑکتے ہوئے گردھر نے مخصوص شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

گرم چائے کے گھونٹ گلے کے نیچے اتارتے ہوئے لطیف کو پھر وہ کھال جلائے جانے

والی بات یاد آئی۔ ''ایک دن تو بھی آ جا' نماز پڑھنے۔ کہہ دیجیو اللہ میاں سے اس کا ثواب لطیفوا کے نام لکھوا دیں۔ تو ٹھہرا ہندو۔ تجھے تو نمازیں معاف ہیں۔'' بڑبڑ کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا لطیف ٹھیک محمود صاحب کی بغل میں جا کھڑا ہوا۔ نمازی ابھی آ ہی رہے تھے۔

صاف ستھرے لباس میں ملبوس کسی بھینی بھینی خوشبو میں مہکتے سید محمود علی ایڈووکیٹ' ایم اے ایل ایل بی۔ زمیندار خاندان کے چشم و چراغ۔ ان کی بغل میں ملگجا کرتا پاجامہ پہنے پسینے میں شرابور پنکچر بنانے والا جاہل مستری لونڈا۔ بلکہ ذرا سی دیر قبل تو وہ صرف گندا، پھٹا بنیان پہنے اکڑوں بیٹھا کسی گاڑی کے ٹائروں میں ہوا بھر رہا تھا۔ پھر جلدی جلدی چائے سڑپ کر اس نے دوکان میں ٹائروں پر رکھا کرتا اٹھایا اور تیزی سے گلے میں ڈالتا لپ جھپ بھاگا تھا مسجد کی طرف۔

''ہم نماز ختم ہوتے ہی کودتے پھاندتے بھاگ آئیں گے۔ ذرا رکیو۔ ضروری بات بتانی ہے۔'' چلتے چلتے اس نے کہا تھا ''ہوائی جہاز لے کے بھاگیو متی۔''

گردھر کو پتہ تھا۔ لطیف کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ لگتا ہے طے ہوگئی۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں نچاتے گردھر نے سر کھجایا۔ لوگ نیت باندھ رہے تھے۔ لطیفوا بھی۔

ایک بات تو ہے لطیف کے دھرم میں کوئی چھوا چھوت نہیں۔ یہاں شہر میں پتہ نہیں چلتا لیکن گاؤں کے مندر میں جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں' گردھر مندر کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ باہر سے پرنام کر کے چلا جانا پڑتا تھا۔ یوں پرنام تو وہ مسجد کو بھی کر لیا کرتا تھا۔ اندر بھگوان کا نام ہی تو لیا جاتا ہے۔ اب نام لینے والے جیسے بھی ہوں۔ ویسے صاحب بہت اچھے ہیں۔ اور جوہرا۔ نہیں زہرا بٹیا (زہرا نے ڈانٹ ڈانٹ کے اس کا تلفظ درست کرایا تھا۔ جہاں اس نے جوہرا کہا اور زہرا نے بڑی بڑی آنکھیں نکالیں...پھر!) وہ تو سب سے اچھی ہیں۔ میٹھی مسکراہٹ' میٹھا چہرہ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا زہرا کیسی لگتی ہے۔ اسے دیکھ کر بہت سی چیزیں ذہن میں آتی تھیں۔ کھیت میں کھڑے پکے گیہوں کی سنہری بالیاں' رہٹ سے گرتا شفاف ٹھنڈا پانی یا پھر بور سے لدا خوشبو بکھیرتا آم کا درخت اور سب سے عجیب بات یہ کہ زہرا کو دیکھ کر کبھی کبھی گردھر کے ذہن میں اس کی نپٹ دیہاتی ماں در آیا

کرتی تھی جس کا رنگ کالا تھا اور پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ زہرا اور وہ اتنی ہی مختلف تھیں جتنی انہیں ہونا چاہئے تھا۔ پھر وہ کیا بات تھی... کچھ آنکھوں میں، کچھ چہرے پر جو گرفت سے بالکل ہی پرے تھی لیکن تھی تو ضرور۔ ورنہ ایسا کیسے ہوتا۔ گردھر سوچتا تو ذہن کے تاریوں الجھ جاتے جیسے زہرا کا اون کا گولہ جو بلی کے بچے نے پنجوں میں لے کر یوں الجھا دیا تھا کہ زہرا رونے لگی تھی۔

زہرا کا خیال آنے پر گردھر ہولے سے مسکرایا۔ اپنے ذہن کے سارے گڈمڈ تاروں کے باوجود وہ زہرا کا راز دار تھا۔

اس نے زہرا کو ایاز کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

یوں تو زہرہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ کئی مرتبہ وہ اسے چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے لڑکے ادھر ادھر گھومتے دکھائی دیئے تھے۔ زہرا کی بڑی بہن عائشہ کی شادی ہوئی تھی تو لڑکیوں کے ساتھ کئی لڑکے بھی آئے تھے۔ یہ سب ساتھ پڑھتے تھے۔ لیکن ایاز کے ساتھ دیکھ لئے جانے پر زہرا کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی جیسے کسی چور کے سیندھ کاٹتے وقت دیکھ لئے جانے پر ہو جائے۔

''پاپا سے نہیں کہو گے نہ۔'' اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ مگر ایاز کے چہرے پر اعتماد تھا۔ وہ جلدی سے یوں زہرہ کے سامنے آ گیا تھا جیسے اسے سب کی نظروں سے بچا لینا چاہتا ہو۔ جیسے کہہ رہا ہو اتنا مت ڈرو زہرہ۔ میں ہوں نا۔

''نہیں کہیں گے بٹیا'' گردھر کے لہجے میں اس کا خلوص نیت تھا۔ وہ ساری گونگی عزت اور محبت تھی جو وہ زہرا کے لئے دل میں لئے گھومتا تھا۔ وہ نمک تھا جو کئی پشتوں سے گردھر کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا چلا آیا تھا۔

کئی پشتیں :

زہرا کی نانیہال سے گردھر کا رشتہ کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ ۴۷ء میں زہرا کی امی پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی والدہ کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ قصبے میں زبردست کشیدگی تھی۔ اب فساد ہوا کہ جب ہوا۔ گردھر کا باپ بنواری اس وقت کوئی سال بھر کا تھا۔ گردھر کے دادا پر بھو مانجھی

نے بکریاں پال رکھی تھیں۔ وہ زہرا کے نانیہال میں کھیت مزدور تھا اور دوسرے کام بھی نمٹا دیا کرتا تھا جیسے گھر سے متصل پائیں باغ کی دیکھ بھال اور رکھوالی' نئے درخت لگوانا' پرانوں کی نگرانی کرنا، موسمی پھول اگانا۔ وہ ذات کا مالی نہیں تھا لیکن پھلوں اور پھولوں کا اسے زبردست علم تھا۔ گھر میں جب بھی آتا ہر طرف سے پربھوا، پربھوا! آوازیں لگتی رہتیں۔ پربھوا نہ ہوتا تو پتہ نہیں زہرا کی امی کا کیا حشر ہوتا۔ ان دنوں اس نے دونوں وقت لٹیا میں بکری کا دودھ پہنچایا۔ کئی لوگوں نے اسے سمجھایا۔ ''معلوم نہیں کہ نوا کھالی میں ان مسلمنٹوں نے کیا آفت ڈھائی ہے؟ ارے کاٹ کے پھینک دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے محلے میں جاتا ہے۔ سانپ کو دودھ پلا رہا ہے۔ اس سالے کو تو ہمیں کاٹ کے پھینک دیں گے۔'' پربھوداس ماجھی عرف پربھوا پر اس آخری دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا۔ گلیوں گلیوں چھپتا چھپاتا پربھوا کسی طرح پہنچ ہی جاتا۔ بچی کو گود میں لے کر دلارتا اور پھر لپ جھپ بہت سے کام بھی نمٹا کر واپس ہو جاتا۔ زہرا کے سگے چچا کا خاندان چلا گیا۔ پھر چچیرے چچا گئے۔ اور بھی بہتیرے رشتہ دار۔ پربھو نے ایک دن ہاتھ جوڑ کر کہا مالک لوگ بھی چلے جائیں گے کیا۔ زہرہ کی نانی' جو اس وقت نوجوان تھیں اور ننھے ننھے تین چار بچوں کی ماں' آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں نہیں رے پربھو۔ ہم اپنی مٹی نہیں چھوڑ رہے' جانے دو جو جا رہے ہیں۔ اس کے بعد سے کسی نے اسے پربھوا نہیں کہا۔ وہ بڑوں کے لئے پربھو اور بچوں کے لئے پربھو چاچا بن گیا تھا۔ مالکوں نے اس کے نام کچھ زمین کر دی۔ زہرہ کی امی نے گردھر کو تعلیم کے لئے ماہانہ خرچ بھیجا لیکن تعلیم جیسا جان لیوا اور بیکار شغل اسے سخت ناپسند ہوا۔ مارے باندھے پانچ سات جماعتیں پڑھیں پھر گھر سے بھاگ گیا۔ بڑی مشکل سے پکڑ دھکڑ کر لایا گیا تو زہرہ کی امی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ ڈرائیونگ اسکول میں رکھ کر ڈرائیونگ سکھوائی پھر کہا۔ ''گردھرا اگر کہیں اور جانا چاہے تو چلا جا' نوکری ڈھونڈ لے۔ یہاں رہنا چاہے تو رہ جا۔'' گردھر کہاں جانے والا تھا۔ یہاں کھانا پینا' کمرہ سب مفت تھا۔ کبھی گاڑی نکلی تو چلا لی ورنہ گھر کے سارے کام نمٹاتا رہتا تھا۔ پندرہ سو ماہوار مل جاتے تھے جو پورے کے پورے بچ جاتے تھے۔ تیس برس کا ہو چکا تھا اور گاؤں کے حساب سے بڈھا ہو چلا تھا اس لئے ماں

جلے پیر کی بلی کی طرح لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دستور کے مطابق لڑکی والوں نے، جنہیں اس کے گھر آنا تھا، آنا بند کر دیا تھا۔ گردھر کے جوڑ کی ساری لڑکیاں بیاہ چکی تھیں اور کئی کئی بچوں کی ماں تھیں۔ گردھر بڑی زور سے ہنس کر کہتا تھا ''ارے کسی بیٹی والے کی مت ماری گئی ہے جو ہم سے بیٹی بیاہے گا'' لیکن جب سے لطیفوا اپنی نسبت کی بات کرنے لگا تھا گردھر کے دل میں بھی کچھ لڈو پھوٹنے لگے تھے اور آج اس نے زیبا کو ایاز کے ساتھ دیکھ کر سر کھجا کر سوچا تھا کہ کیسے اچھے لگ رہے ہیں دونوں جیسے رام سیتا کی جوڑی۔ مگر صاحب؟ صاحب اور مالکن ... زہرا بٹیا کی امی ... گردھر اس گھر کو یوں جانتا تھا جیسے بطخ تالاب کو جانے...

سید محمود علی اور سید مسعود علی نے اپنے والد سے یہ مکان ورثے میں پایا تھا۔ وسیع و عریض لیکن خاصی بری حالت میں تھا۔ زیادہ تر حصے میں کھپریل کی چھت۔ دیواریں بوسیدہ۔ دونوں کی شادیاں جن لڑکیوں سے ہوئیں وہ حقیقی چچا زاد بہنیں تھیں۔ محمود علی اور مسعود علی کی والدہ سیدانی بی بی کہلاتی تھیں۔ خاندان کی کئی خواتین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایک گھر کی دو لڑکیاں نہ لائیں عموماً بہنیں بہنیں مل کر ساس کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیتی ہیں۔ حبِّ معاویہ ہو نہ ہو بغض علی بڑا زبردست اتفاق پیدا کرتا ہے۔ لیکن سیدانی بی بی کی دلیل دوسری تھی ہمارے دونوں بیٹوں میں بڑی محبت ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ محبت برقرار رہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شادی ہوئی نہیں کہ نگاہیں بدلیں۔ وجہ: بیویاں۔ ہم نے خود دیکھا ہے ہمارے دیور ہم پر جان چھڑکتے تھے شادی ہوتے ہی نظریں پھیر لیں۔ ہم نے بہت چاہا تھا اپنی چھوٹی بہن لے آئیں۔ خدا بخشے ہماری ساس نے ایک نہ سنی۔ اب جو آئیں اللہ کی سنواری وہ شروع سے ہی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چنتی ہوئی آئیں۔ ہم تو اپنے بیٹوں کے لئے دو بہنیں ہی لے کر آئیں گے۔ بیویوں میں ایکا ہوگا تو بیٹے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنے رہیں گے۔

سیدانی بی بی کو دو سگی بہنیں نہ مل سکیں تو انہوں نے چچا زاد کو بہت غنیمت جانا۔ خاص طور

پر اس لئے بھی کہ دونوں مشترکہ خاندان میں پیدا ہو کر ساتھ ساتھ پلی بڑھی تھیں۔ عرصے تک سیدانی بی بی نے اپنے فیصلے کی کامیابی پر خود اپنی پیٹھ خوب ٹھوکی۔ گھر میں چولہا ایک بنا رہا تھا۔ بچے ہوئے تو پتہ ہی نہ چلتا کون کس کا ہے۔ ہر نماز میں وہ ایک فاضل سجدہ شکر کا ضرور بجالاتیں مگر:

مگر ایسا ہوا کہ سید محمود علی رفتہ رفتہ پیسے والے ہوتے گئے۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے۔ ترقی پا کر اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے۔ پچھواڑے کی آمدنی چلی آ رہی تھی' اب مرتبے کا زعم بھی آیا۔ کچھ عرصے تک باپ دادا کی اقدار کو سنبھالے رکھا تھا لیکن اب وہ چرمرانے لگیں۔ بیوی کے زیور بنے' بچوں کا نام پرانے اسکولوں سے کٹوا کر شہر کے بہتر اداروں میں لکھوایا گیا (یہاں بھی جوڑ توڑ اور پیسوں کی فراوانی نے اپنی افادیت منوائی' جن کمروں میں محمود علی اور ان کا کنبہ رہتا تھا ان میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں) مسعود علی ایسے محکمے میں اسسٹنٹ تھے جہاں نہ مستقبل قریب میں کوئی ترقی ہونی تھی نہ ہی بالائی آمدنی کی گنجائش تھی ورنہ ایمان ان کا بھی ایسا پختہ نہیں تھا کہ موقع ملنے پر ثابت قدم رہ سکیں۔ مرتبے میں فرق آیا تو حسد اور رقابت نے اپنے پر پھیلائے۔

پہلا نفاق مکان کی مرمت اور رنگ وروغن کے سوال پر پیدا ہوا۔

"بھائی جان انجینئر ہیں۔ دوسرے پیسوں کی فراوانی ہے وہ درست کرائیں مکان۔ ہمارا کیا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا بھی ہماری اوقات کے عین مطابق رہے گا۔" مسعود علی کی بیوی نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

محمود علی کی بیگم نے جواب دیا کہ مکان پر حق دونوں کا برابر ہے۔ اس لئے کچھ رقم مسعود علی بھی نکالیں ورنہ وہ صرف اپنا حصہ درست کرائیں گی (ان کا حصہ درست ہی نہیں ہوا' چمک بھی گیا) لیجئے صاحب مکان میں میرا حصہ' تیرا حصہ شروع ہو گیا۔

مسعود علی اور ان کے اہل وعیال میں جو احساس کمتری پیدا ہوا اس نے طعن تشنوں کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چولہا الگ ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ حصے جو ذہنوں میں

بٹے تھے، نقشے پر آ گئے۔ آنگن بیچ دیوار اٹھ گئی۔ سیدانی بی بی بہت رنجیدہ تھیں لیکن عمر پوری ہو رہی تھی۔ رنجیدہ رہنے کو زیادہ دن نہیں رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد تو کوئی احتساب ہی نہ رہا۔

مسعود علی کا اکلوتا بیٹا لائق نکلا تھا۔ آج کے دستور کے مطابق کمپیوٹر کی ڈگری حاصل کی اور منھ اٹھا کر بگٹٹ بھاگا بنگلور کی طرف جو سارے کمپیوٹر والوں کا مکہ بنا ہوا ہے۔ دو لڑکیاں تھیں ان کا بیاہ مسعود علی نے ذرا جلدی ہی کر دیا تھا۔ کہتے تھے قلیل آمدنی ہے اور دو، دو ہیں سر پر۔ اس لئے سوائے ہڈی بوٹی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ سادات کی ایک بستی سے دو نالائق لونڈوں کو پکڑ کر نکاح کر کرا کے چھٹی کی۔ لڑکیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔

مسعود علی پٹنہ سے باہر کبھی نہیں نکلے تھے۔ بیٹے نے بنگلور بلایا تو بڑا شہر دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں سے ہی دوست احباب کو فون کر کر کے بنگلور کے یوں گن گاتے جیسے سیدھے نیویارک پہنچ گئے ہوں۔ واپس لوٹے تو بات پیچھے ''وہاں اس طرح ہوتا ہے'' یا 'وہاں' تو ایسا ہے'' لوگ سمجھ جاتے 'وہاں' سے ان کی مراد کیا ہے۔ پھر مسعود علی نے 'وہیں' جا کر بس جانے کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔ یہاں ان کا رہ ہی کون گیا تھا اور پھر وہاں شداد کی جنت جو تھی۔

سید مسعود علی نے بڑے بھائی کو کانوں کان خبر کئے بغیر کہ کہیں وہ رخنہ انداز نہ ہوں، اپنے حصے کا مکان بیچ ڈالا۔

''سنا ہے بھائی مسعود علی نے مکان بیچ دیا۔'' ایک رشتہ دار خاتون نے محمود علی کی اہلیہ سے کہا

''ہاں۔ دُھنوں کو بیچ گئے۔''

''اے ہے، دھنوں کو'' انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کہا

''ہمیں بتاتے تو ہم ہی خرید لیتے۔ باپ دادا کا مکان ہاتھ میں رہتا۔ یہ تو ہاتھ مل کے رہ گئے۔ اور بیچا بھی تو کس کو۔ اب رہو دھنوں، جلاہوں کے ساتھ۔'' دو تین بار اہلیہ مسعود علی نے دھنوں کو دھنکا تو زہرا سے نہ رہا گیا۔

''امی دُھنے کون ہوتے ہیں؟''

''ارے وہی جو روئی دھنتے ہیں۔''

جاڑوں کی آمد ہوتی تو گلی محلے میں اچانک وہ نمودار ہو جایا کرتے تھے۔ بے چارے' خستہ حال سے لوگ۔ اکثر تو ننگے پیر' لنگی کرتے میں ملبوس۔ کاندھے پر دھنکی رکھے۔ کبھی کبھی وہ دھنکی کے تار چھیڑتے تھے۔ یہ گویا ان کی موجودگی اعلان تھا۔ زہرہ نے اکثر ان کی طرف دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا۔ لیکن اب ان کا آنا بہت کم ہو گیا تھا اس لئے کہ زیادہ تر لوگ لحاف گدے یا بھرے بھرائے لینے لگے تھے یا مشین پر بھیج کر بھروا لیتے۔ گھر پر روئی دھنوانے میں اب لوگوں کو قباحت محسوس ہونے لگی تھی۔ زہرہ کو اس طرح کے بھی لوگوں پر بڑا ترس آتا تھا۔ دوسروں کے یہاں جڑاول کا انتظام کرانے والے یہ مفلوک الحال لوگ اکثر شدید سردی میں بھی محض لنگی کرتے میں ملبوس نظر آتے۔ جاڑا زیادہ پڑتا تو سر پر انگوچھا لپیٹ لیتے۔ یہ محلے کا دورہ کرتے تو اکثر چھوٹے چھوٹے لونڈے ان کے پیچھے لگ لیتے اور ناک سے دھنکی کی آواز نکالتے۔

''امی تو کیا اب ہر وقت ہمارے یہاں تن تن تائیں تائیں کی آواز گونجتی رہے گی؟'' دھنوں کی مفلوک الحالی سے زہرہ کو جتنی بھی ہمدردی رہی ہو دیوار بیچ گھر میں روئی دھنی جائے اور شور مچتا رہے' یہ ذرا گڑبڑ معاملہ تھا۔ پھر یہ کہ کسی غریب دھنے نے چچا ابا کا مکان خریدا کیسے۔ اتنے پیسے آئے کہاں سے اس کے پاس۔ یہ کون سی قسم کا دھندا ہے؟

''بے وقوف' ہر دھنا روئی تھوڑی دھنتا ہے۔''

''نہیں دھنتا تو پھر وہ دھنا نہیں رہ جاتا۔''

''بڑی کٹھ حجت لڑکی ہے۔'' زہرہ کی والدہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔ آج محمود علی صاحب نے مرغ دو پیازے کی فرمائش کی تھی۔

چلتے وقت چچا ابا مل کر گئے۔ انہوں نے گلے شکوے بھلا دینے کو کہا (یہ مکان بیچ دینے والا شکوہ کیوں کر بھلایا جا سکتا ہے' یہ نہ سوچا انہوں نے) اور ایک بار 'وہاں' ضرور آنے کی

درخواست کی تا کہ بھائی جان اور ان کے اہل وعیال کی آنکھیں کھل جائیں۔اور وہ بھی دیکھ لیں کہ اب ان کے کیا ٹھاٹھ ہوں گے اور وہ کیسے شہر میں رہیں گے۔

دوسرے دن وہاں احمد حسین بی اے، ایل ایل بی کی تختی لگ گئی۔

سامان اترا تو اس میں ٹی وی، فرج، صوفہ سیٹ، ایک عام متوسط گھر کی سبھی چیزیں تھیں۔ اچھے صاف ستھرے ذوق کی غماز۔ قیمت کے اعتبار سے بھی کم وبیش ویسی ہی تھیں جیسی مسعود علی کے گھر میں، بس شجرہ مختلف تھا۔

ایک گمنام شجرہ

احمد حسین صاحب کے دادا (کہ تاریخ بس دادا تک ہی یاد تھی اور گھر کے کسی کونے کھدرے میں کہیں کوئی کرم خوردہ شجرہ بھی نہیں تھا اس لئے کہ شجرہ وہی بنواتے ہیں جو اپنی عظمت ماضی میں ڈھونڈتے ہوں) کاندھے پر دھنکی لئے کڑکڑاتے جاڑوں میں بھی لنگی کرتے میں ملبوس، سر پر پھینٹا باندھے، صاحب استطاعت لوگوں کے یہاں روئی دھن کر لحاف گدے بھرتے گھوما کرتے تھے۔اگر وہ مقامی آدمی ہوتے تو شاید محلے کے کسی اندھے چندھے، جھریوں بھرے چہرے والے بزرگ کو یاد بھی ہوسکتے تھے۔ان کا اسم شریف ممدو تھا جو بگڑ کر مادو اور پھر کچھ ستم ظریفوں کے تلفظ تلے آکر مادھو ہوگیا تھا۔ وہ تا زندگی اسی عرفیت سے جانے جاتے رہے۔موصوف لحاف میں دھاگے ڈالنے میں ماہر تھے۔خاص کر اگر لڑکی کے جہیز کا لحاف ہوتا تو وہ اس میں اپنی ساری فنکاری صرف کردیتے اور اجرت میں کمی کردیتے کہ بٹیا کا بیاہ ہے۔گدوں میں ایسا دھاگہ ڈالتے کہ روئی سالوں ٹس سے مس نہ ہوتی۔پاؤ ڈیڑھ پاؤ روئی دھن کر بادلوں کی طرح ہلکی کر ڈالتے اور بڑی سی دلائی میں یوں برابر کر کے پھیلاتے کہ معلوم ہوتا کہ بس ململ کی ایک تہہ ڈال دی گئی ہے۔ان خوبصورت، بادلوں جیسی ہلکی دلائیوں کو خواتین بکل مار کر لپیٹ لیتی تھیں اور روئی ذرا نہ ٹوٹتی۔

مادھو میاں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ ان کی دھنکی کے ساتھ ان کے کاندھے پر مٹ میلے سے کھیس کا ٹکڑا پڑا ہوتا تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی وہ ان کے لباس کا حصہ تھا۔نماز کا وقت ہوتا

(جس کا اندازہ وہ آنگن یا دیوار پر پڑتے سایوں سے لگایا کرتے تھے) تو وہ اس کثیف ٹکڑے کو بچھاتے جو جگہ جگہ سے مسک رہا تھا اور سربسجود ہو جاتے۔ جو یاد آتا پڑھ ڈالتے جو بھول گئے ہوتے اس کی فکر نہ کرتے۔ بیوی اس جانماز کے کونے میں چنا چبینا باندھ دیتی تھیں وہ اسے ظہر سے پہلے کھا لیتے۔ جانماز ''فری'' ہو جاتی۔ جس کے گھر کام کر رہے ہوتے اس سے پانی مانگ لیتے۔ نہ کام ملا ہوتا اور کسی پیڑ کے سایے میں نماز پڑھی ہوتی تو کہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے نلکے سے کام چلا لیتے۔ ان کے دل میں ایک ہی آواز تھی۔ ان کے بیٹے اللہ رکھا عرف بنن کو دھنکی کاندھے پر رکھ کر گلی گلی مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ ایک تو کڑی مشقت' اس پر سے لوگوں کا تحقیر بھرا برتاؤ۔ ستم بالائے ستم' محلے میں گھومتے تو چھوٹی امت پیچھے لگ جاتی ''تنک تنک تائیں تائیں' ہگنے کو کہاں جائیں۔'' وہ لاکھ دھنکی سے دھمکاتے لیکن بے شرم بچے ذرا نہ ڈرتے۔ ایک حقیر دھنا اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک آدھ چپت لگا دیتا تو روزی روٹی پر بن آتی۔

اور وہ حقیر سا مفلوک الحال انسان باپ دادا کے وقت سے چلے آ رہے پشتینی دھندے سے بھی تو منہ نہیں موڑ سکتا تھا اس لئے اس کی سوچ بھی اس سے آگے نہیں نکل سکی تھی۔ اللہ رکھا عرف بنن کے لئے ان کی خواہش بس اتنی ہی تھی کہ ایک دوکان مل جائے اور وہ وہاں بیٹھ کر روئی دھننے اور دھاگہ ڈالنے کا کام کرے۔ جسے ضرورت ہو خود وہاں آ کر کام کرائے اور لے جائے۔

ان کے بے ریا' معصوم سجدے اللہ کے یہاں قبول ہوئے۔ ان تھک محنت اور انتہائی کفایت شعار زندگی کی وجہ سے انہوں نے اتنا پیسہ بچا لیا کہ عمر کے کچھ سال باقی رہتے انہوں نے ایک چھوٹی سی دوکان کرائے پر لے لی۔

اللہ رکھا ناخلف نہیں نکلے۔ ایسی ہی محنت کی جیسے مادھومیاں کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد دوکان انہوں نے خرید لی۔ ایک غریب رشتہ دار عورت کو دھاگے ڈالنے کے کام پر ملازم رکھا۔ پھر کاروبار مزید بڑھا کر دوکان پر کپڑوں کے تھان اور روئی بھی رکھنے لگے۔ ہنر کی قدردانی ہوئی۔ ان کی سوچ نے بھی ترقی کی اور مادھومیاں سے کئی قدم آگے نکل گئی۔ اپنے

بیٹے کو انہوں نے پڑھنے کے لئے اسکول بھیج دیا اور گھر پر ٹیوٹر بھی رکھا۔ اللہ رکھا عرف بجن کو اپنا نام اور عرفیت دونوں سخت ناپسند تھے اس لئے بیٹوں کے نام احمد حسین، رضوان حسین وغیرہ رکھے گئے۔ دوکان قائم رہی لیکن جب اللہ رکھا اپنے والد کی عمر کو پہنچے تو ان کی حیثیت سپر وائزر کی ہوگئی تھی اس لئے کہ دوکان اب کارندوں کے سپرد تھی۔ رضوان حسین پورا حساب کتاب رکھتے تھے اور شام کا خاصہ وقت دوکان کو دیتے تھے جسے وہ فیکٹری کہا کرتے تھے۔ احمد حسین نے گریجویشن کیا اور اس کے بعد اپنے اساتذہ کے مشورے سے، جنہوں نے ان کے ذہنِ رسا کا اندازہ لگا لیا تھا، وکالت پڑھی۔ کنبہ بڑھا تو انہوں نے الگ مکان لینے کی بات کی۔ اس میں کنبے کی پوری رضامندی شامل تھی۔ سید صاحب مکان بیچ رہے ہیں، یہ ایک دلال کی معرفت معلوم ہوا تو بڑے احترام وعقیدت کے ساتھ (اور اس امید کے ساتھ بھی کہ سید کا مکان ہے ضرور اس میں برکت ہوگی) انہوں نے وہاں سے ہجرت کرنے والے سید مسعود علی کا مکان خرید لیا جو دراصل دو بھائیوں کے مشترکہ مکان کا نصف حصہ تھا۔ حسب توفیق انہوں نے اس کی مرمت کرائی۔ رنگ وروغن کرا کے مزید کارآمد بنایا جس طرح وہ اپنی اولاد کو بنارہے تھے۔

احمد حسین نداف ولد اللہ رکھا ولد مادھو میاں نے بیٹے کا نام رکھا ایاز احمد وارثی اس لئے کہ احمد حسین صاحب کو وارث پیا سے بے حد عقیدت تھی۔ دوسرے وارثی ایک مبہم سا ٹائٹل ہے۔ مبہم اور باعزت اور صوتی اعتبار سے خوبصورت۔ وکالت پڑھنے کے بعد سے ذہن پر اور بھی جلا ہوگئی تھی۔ کہتے تھے اب یہ لوگ جو صدیقی، فاروقی، علوی اور عثمانی وغیرہ لگاتے ہیں تو ہم تو کہیں یہ سارا عقیدت کا کھیل ہے۔ میاں ذرا پر دادا سے اوپر جا کے تو کوئی دکھائے تو ہم جانیں۔ دادا کے باپ تک پہنچتے پہنچتے زیادہ تر لوگ ہکلانے لگتے ہیں اور کہیں ان کے بھی باپ کا پوچھ لیا تو بالکل ہی پالکی دھری رہ جائے گی لیکن یار لوگ ہیں کہ ساڑھے چودہ سو برس کی خبر لا رہے ہیں اور مان لیا شجرہ موجود بھی ہے تو!

تو سن لیجئے ڈپٹی صاحب کی کہانی:

ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے (ڈپٹی جن کے نام کا جزلاینفک تھا) اپنی بیٹی کی شادی شیوخ

کی ایک ایسی شاخ کے فرزند ارجمند سے طے کر دی جو شیخ گھڑلدے کہلاتے تھے اس لئے کہ کبھی امتداد زمانہ سے مجبور ہو کر چند پشت پہلے ان کے گھر کے کچھ افراد گھوڑوں پر سامان لے کر بیچنے نکلے تھے۔ اس طرح انہوں نے سوداگری شروع کی تھی۔ ڈپٹی سلیم احمد صدیقی کے خاندان کے زیادہ تر لوگ یا زمیندار تھے یا بڑے کاشتکار۔ نئی نسل کے کچھ افراد سرکاری نوکریوں میں بھی آ رہے تھے (جن کے رول ماڈل ڈپٹی سلیم احمد تھے) اور گرچہ رسولؐ خدا نے خود نہ صرف تجارت کی بلکہ تجارت کو ایک افضل پیشہ قرار دیا' بے چارے شیخ گھڑ لدے اس تحقیر آمیز خطاب سے نوازے گئے۔ حالانکہ اب گھوڑوں پر سامان لاد کر ادھر ادھر لیجانے کی ضرورت نہیں رہی تھی اور جماعت مختلف دھندوں' بشمول تجارت، میں لگی ہوئی تھی لیکن یہ خطاب ان پر چپک گیا تھا۔ جو شیوخ خود کو برتر قرار دیتے تھے وہ ان کے یہاں شادی بیاہ سے اجتناب کرتے تھے' اور اس طرح کے رشتے کو جو ڈپٹی سلیم احمد نے طے کیا' باعث تذلیل گردانتے تھے۔

روایت سے بغاوت کرنے والے گرچہ بہت کم ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں رہے ہیں۔ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کو ملیچھ کے ذلیل لقب سے نوازنے کے باوجود تیسری صدی قبل مسیح میں چندر گپت موریہ نے انہیں ملیچھوں میں سے ایک کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ ڈپٹی سلیم احمد بھی روایتوں کے باغی تھے۔ انہوں نے اپنی ڈپٹیانہ نظر سے گھڑلدوں کے بیٹے کو پرکھا اور اسے نہایت لائق و فائق جانا' بیٹی دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی اور شادی طے کر دی۔ (آخر تھے تو وہ بھی شیوخ ہی۔ اس سے آگے کی بغاوت تو انہوں نے کی نہیں تھی) خیر خبر عام ہوئی تو ایک رشتہ دار بزرگ دراتے ہوئے ڈپٹی صاحب کے اجلاس میں گھس آئے (خاصے عمر دراز تھے اس پر لہراتی ہوئی نورانی داڑھی' لانبے اور بارعب۔ اردلی سے ڈپٹ کر بولے ''ہم ڈپٹی صاحب کے چچا ہیں۔'' وہ انہیں روک نہ سکا)

''کیا میاں۔ یہ کیا سن رہے ہیں؟ خاندان میں لڑکوں کا کال تھا؟''

''نہیں۔ بالکل نہیں تھا۔ ایک سے ایک نالائق موجود ہیں'' جواب ملا۔

''تمہارے اندر سرکاری نوکری کا تکبر آ گیا ہے۔ اللہ سے توبہ کرو۔ سب کو نالائق قرار

دے رہے ہو۔''

''اور آپ شیوخ کی ایک بڑی جماعت کو نالائق قرار دے رہے ہیں۔''

''بالکل نہیں۔ ہوں گے وہ اچھے لیکن بیٹی تو کفو میں ہی دی جاتی ہے۔''

''سنئے بزرگوار۔ میں نے کفو کے تین معیار مقرر کئے ہیں۔ شرافت، تعلیم اور وجاہت۔ اگر کوئی لڑکا ان پر پورا اترتا ہے تو میں بلا تکلف بیٹی بیاہوں گا۔ پھر وہ شیخ گھڑلدا ہو یا خرلدا۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔ میں مصروف ہوں۔ مگر ہاں ذرا ٹھہرئے'' انہوں نے گھنٹی بجا کر اردلی کو طلب کیا۔'' باہر ایک صاحب بیٹھے ہوں گے رجب علی بلبل۔ انہیں اندر بھیج دیجئے اور ہاں چائے بھی منگا لیجئے'' رجب علی ایک چڑی مار صورت، مفلوک الحال مقامی ہستی تھے۔ شعروشاعری میں شدبدر کھتے اور بلبل تخلص فرماتے تھے۔ عرصہ سے باریابی کے خواہش مند تھے۔ کئی مرتبہ آن آن کے لوٹ چکے تھے۔ آج بھی پرزہ اندر بھجوا کے کوئی گھنٹہ بھر سے جھک مار رہے تھے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

''بلبل صاحب'' ڈپٹی صاحب نے مخاطب کیا

''جناب والا۔'' وہ گھٹنوں تک جھک گئے۔

'' ہمارے ہونے والے داماد شیخ جاوید حسن گھڑ لدے (گھڑلدے کو انہوں نے قدرے تبسم کے ساتھ ادا کیا) کا ایک شجرہ تیار کیجئے تو۔ والد کا نام شیخ ولی حسن۔ دادا شیخ علی حسن۔ آگے آیت۔ پھر آپ جانیں۔'' ڈپٹی صاحب ادائے بے نیازی سے فائلوں پر جھک گئے۔ اگلے دن کئی اہم مقدمے ان کے اجلاس میں پیش ہونے والے تھے۔

اگلے دن بلبل صاحب شجرہ لے آئے۔ شیخ جاوید حسن صدیقی کا سلسلہ نسب سیدھا حضرت ابوبکر صدیق سے مل رہا تھا۔ اونٹوں پر سامان لاد کر تجارت کرنے والے حضرات کے اخلاف ہندستان آ کر گھوڑوں پر تجارت کریں (کہ یہاں اونٹ کچھ ریگستانی علاقوں کو چھوڑ کر باقی جگہوں کے لئے نہ درکار ہیں نہ دستیاب) تو یہ تو عین عزت افزائی ہے۔ کمتر ٹھہرانے کا جواز کہاں نکلتا ہے۔ جو ٹھہرائیں وہ قابل گردن زدنی۔

ڈپٹی صاحب نے ہنس کر پوچھا'' بلبل میاں آپ کو یہ ان کے اسلاف کے سارے نام

کہاں سے مل گئے۔''

''علی حسن صاحب کے اوپر دو نام تو حقیقی مل گئے تھے۔ کچھ بزرگ رشتہ داروں سے تحقیق کر لی تھی۔ اس کے بعد حضور، آپ کا حکم تھا۔ اس لئے باقی شاعری ہے۔'' ڈپٹیانہ وقار کو بھول کر ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے قہقہہ لگایا۔ گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوائے۔

(ڈپٹی صاحب کی داستان کے راوی ۹۰ سالہ حکیم خلیق احمد صدیقی تا دمِ تحریر بقید حیات ہیں۔ یہ داستان انہیں ڈپٹی صاحب نے بہ نفس نفیس سنائی تھی۔ شیخ گھڑلدوں سے حکیم صاحب موصوف کی ذاتی واقفیت بھی تھی)

مکان کا نصف حصہ دھنوں کے قبضے میں چلے جانے اور پڑوس دوام کا احتمال ہونے سے سید محمود علی کی بیگم خاصی کبیدہ خاطر تھیں۔ بار بار ذہن میں آتا تھا کہ یہ وسیع و عریض مکان پورا ان کے قبضے میں ہوتا۔ محلے کے اندر ہونے کی وجہ سے قیمت نہایت واجب لگی تھی۔ وہی وہ بھی دے دیتیں۔ درمیان کی دیوار گرا کر کچھ ترمیم و تزئین کے بعد کیا عمدہ حویلی کی صورت ہو جاتا۔ بیٹوں کی شادیاں ہوں گی۔ بہوئیں آئیں گی۔ زہرہ کی تعلیم مکمل ہو رہی تھی۔ داماد بھی آئے گا ہی۔ اچھے علاقے میں مکان خریدنا فی الحال بساط کے باہر تھا۔ وہ بھی اب تو فلیٹ مل رہا تھا، مکان تھے کہاں۔ ایک مرتبہ ایک دلال آیا تھا۔ جو قیمت لگائی فلیٹ خریدنے کے لئے بھی اس میں اور چند لاکھ ڈالنے پڑتے۔ محمود علی خاموش رہ گئے۔ صاحبزادے اڑے ہوئے تھے ایم بی اے کریں گے۔ مہنگا سودا تھا۔ ان کے لئے بڑی رقم درکار تھی۔ پرس سنبھال کر باہر نکلتے ہوئے محمود علی کی اہلیہ نے مکان کے نصف حصے کے دروازے پر احمد حسین بی اے ایل ایل بی کی تختی پر نظر ڈالی۔ دیور اور چچازاد بہن کے خلاف دل میں غصے کا طوفان اٹھا لیکن پھر جیسے اچانک ہی اس میں کسی نے پاور بریک لگا دیئے۔ ان کی توجہ سامنے سے آتے ہوئے ایک نہایت خوش شکل اور اسمارٹ نوجوان پر پڑی۔ نظریں نیچی کئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ دوسرے حصے کی کال بیل پر انگلی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے جواب ملنے میں کچھ دیر لگی۔ دھوپ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا'' شاید کوئی ملنے

والا ہوگا۔لڑکوں کا ساتھی براتی۔اللہ کی شان ان کے لڑکے بھی تو اب خوب پڑھ رہے ہیں۔"
بیگم محمود نے سوچا۔تبھی اس لڑکے کی نظریں ان پر پڑیں۔اس نے نہایت شائستگی سے سلام کیا قدرے بے دلی سے سر ہلاتی وہ آگے بڑھ گئیں۔

تیسرے چوتھے دن اسی لڑکے نے محمود علی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔اتفاق سے بیگم محمود علی ہی سامنے آئیں "کیا ہے میاں؟ آج پھر تمہیں جواب نہیں مل رہا کیا؟"

لڑکے کی سمجھ میں بات کچھ آئی نہیں وہ کافی کنفیوزڈ سا لگا۔پھر اس نے کہا" آنٹی،امی نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ آج ذاتی مکان میں منتقل ہونے کے لئے مغرب بعد شکرانے کا میلاد کرا رہی ہیں۔آپ ضرور آئیں آپ ہمارے پڑوسی ہیں اور جناب مسعود صاحب کے سگے رشتہ دار بھی۔ہم خود حاضر ہوتے لیکن گھر میں ساز وسامان منتقل کرنے میں اتنے مصروف رہے۔امی نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کچھ خیال نہ کریں۔بعد میں وہ ضرور آئیں گی۔"

"تم کون ہو میاں؟"

"جی ہمارا نام ایاز احمد وارثی ہے ہمارے والد نے آپ کے بھائی صاحب سے یہ مکان خریدا ہے۔جمعہ کی نماز میں میری اور والد صاحب کی جناب محمود صاحب سے ملاقات ہو چکی ہے۔ہم انہیں کی صف میں تھے" وہ مسکرایا اس کے ایک گال میں گڈھا پڑا جس سے اس کی وجاہت میں اضافہ ہو گیا۔

محمود صاحب کی اہلیہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔اللہ کی شان! یہ ان لوگوں کا بیٹا ہے کیسا ستھرا اجلا نقشہ۔صاف رنگ۔لانبا۔اور بولی چالی تو دیکھو۔خوب پڑھا رہے ہیں لوگ۔ انہیں کو عروج ہے آج کل۔یہاں ہم بیٹی کا رشتہ تلاش کر رہے ہیں تو ایک گت کا لڑکا نہیں دکھائی دے رہا برادری میں۔

"کہہ دینا امی سے ہم آئیں گے" وہ قدرے رکھائی سے بولیں۔

پھر چونک کر پلٹیں۔کیا نام بتایا تھا؟

"جی،ایاز احمد وارثی"

زیر لب مسکرائیں۔انہیں معاً شیخ چراغ علی قادری یاد آ گئے۔

قدرِ مشترک درمیان ایاز احمد وارثی و شیخ چراغ علی قادری:

بیگم محمود کے ننہالی قصبے میں ایک دور دراز کے نابینا رشتے دار شیخ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حافظ قرآن تھے اور نکوکاروں میں شمار۔ محلے میں صرف ان کا مکان پختہ اور دو منزلہ تھا باقی سب مکان کچے اور ایک منزلہ تھے۔ تین سو قطعات کی اس مترفعہ داری میں خمرے اور بنکر آباد تھے۔ شیخ صاحب عموماً بان کے پلنگ پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ اکثر دو چار حواری مواری بھی مودب بیٹھے دکھائی پڑ جاتے۔ ان کی رعیت میں سے جو بھی چھوٹا بڑا گذرتا 'السلام وعلیکم جی شیخ جی' کہتا ہوا گذر جاتا۔ شیخ صاحب نابینا تھے لیکن تمام نابینا افراد کی طرح ان کی باقی حسیں نہایت تیز تھیں۔ آواز تو سبھی کی جانتے ہی تھے' کبھی تو قدموں کی چاپ سے پہچان لیتے کہ برابر سے کون گذرا ہے۔ اس دن بھی دور سے آتی جوتے پہنے ہوئے پیروں کی چاپ سے وہ سمجھ گئے کہ کلن انصاری کا چھٹیوں میں گھر آیا جوان بیٹا چلا آرہا ہے۔

''السلام علیکم' لونڈے نے بڑی زور سے سلام داغا لیکن اس کے قدم ہلکے نہیں پڑے۔ طرہ یہ کہ السلام علیکم کے فوراً بعد اس نے ہلکے سروں میں سیٹی بھی شروع کر دی تھی۔ وہ چند قدم بھی نہ بڑھ پایا تھا کہ شیخ شفاعت حسین کا بھاری بھر کم باریش جسم اس پر آن پڑا اور قبل اس کے کہ وہ اس آفت ناگہانی کی نوعیت کو سمجھ سکے' دے دھما دھم' دے دھما دھم چھت کی طرح اسے کوٹ کر رکھ دیا۔

''حرامزادہ۔ کم ذاتوں کی بدذات اولاد۔ علی گڑھ پڑھنے گیا ہے تو تمیز سیکھ کر آتا۔ الٹا اپنی اوقات بھلا بیٹھا۔'' تھک کر شیخ شفاعت حسین پھر پلنگ پر جا بیٹھے۔

شام کو 'رعیت' کا ایک گروہ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ 'لمڈے' کی کم عقلی اور بدتمیزی کے لئے اجتماعی معافی مانگی۔ چار برس سے علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا۔ بھول گیا تھا سلام کیسے کرنا ہے اور یہ کہ چونکہ کم عمر لڑکا تھا اس لئے قدمبوسی کے بعد ہی آگے بڑھنا ہے۔ 'لمڈا' ساتھ نہیں آیا تھا۔ اسکی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی کہ بدن میں درد ہے۔ پیٹھ پر والدہ محترمہ ہلدی چونے کا لیپ لگا رہی ہیں۔ گرچہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے آنے سے صفا

انکار کر دیا تھا اور اگلے ہی دن علی گڑھ واپس لوٹ گیا تھا۔ شیخ صاحب بہت دن سے اس کنبے سے خار کھائے ہوئے تھے جس نے لڑکے کو پڑھنے علی گڑھ بھیجا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ جائے حیرت بھی تھا اور جائے عبرت بھی۔ خمروں کو تو پختہ مکان بنانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ نہ اپنا مکان شیوخ کے مکانوں سے اونچا کرنے کی۔ بنکروں کی آبادی کے مالی حالات کچھ بہتر تھے لیکن پھر بھی ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ محلے کے سر برآوردہ بزرگ کے پاس جا کر نام تجویز کراتے۔ وہ عموماً دن کے حساب سے 'بدھو' جمعراتی' جمن میاں' ممدو' سدو، گھسیٹا، اللہ رکھا قسم کے نام رکھ دیتے۔

اللہ رکھا کے یہاں بیٹا ہوا تو وہ نام رکھوانے نہیں آیا۔ دراصل ٹھیک اس کی ولادت کے وقت اس کی دادی نے چراغ میں تیل ڈال کر بتی اکسائی تھی۔ دادا میاں نے جو گھسیٹا انصاری کے نام سے جانے جاتے تھے بچے کا نام چراغ علی تجویز کر دیا۔

چراغ علی دو ماہ کے ہوئے تو بقول ان کی والدہ ان پر کسی مونث آسیب کا سایہ ہو گیا اس لئے کہ وہ بہت خوبصورت تھے۔ کاجل کے ٹیکے کی اس آسیبی نے چنداں پروانہ کی۔ اس لئے پھنکوانے کے لئے چراغ علی کے والد میاں اللہ رکھا انہیں لپیٹ لپاٹ کرنا بینا حافظ شیخ شفاعت علی کے پاس لائے۔

"بچے کا نام ابھی تک نہیں رکھا گیا ہے" شیخ صاحب نے فرمایا۔

میاں اللہ رکھا نہایت شرمندہ ہو گئے۔ بولے والد صاحب نے چراغ علی تجویز کیا ہے

شیخ صاحب پر ذرا کی ذرا سناٹا چھا گیا۔

بغاوتوں کے چڑیا کے پر جیسے ہلکے بیج ہواؤں کے دوش پر اڑنے لگے تھے۔

"ہم اسے چرغنا کہیں گے"، قدرے توقف کے بعد انہوں نے فرمایا۔ "اور تم سب بھی۔ چرغنا کے نام سے ہی اس کے لئے دعا کر رہے ہیں" انہوں نے پھونک ماری پھر انہوں نے "پڑھی" ہوئی سونف لا کر دی۔ یہ سونف ابال کر اس کا پانی دن میں دو بار پلا دیا کرنا۔ بچہ پیٹ کے اپھارے کی وجہ سے روتا رہتا تھا۔ سونف کا پانی پی کر دو چار روز میں چنگا ہو گیا۔

میاں چرغنے بڑے ہوئے تو محلے میں لونڈوں سے دھول دھپا' سید صاحب کے باغ

کے آم امرود چرانا' آوارہ گردی کرنا ان کا معمول بن گیا۔ باپ دادا دریاں اور کھیس بناتے آئے تھے یہ انہیں ہرگز راس نہ آیا۔ تنگ آ کر والدین نے انہیں بہار میں رہنے والے رشتہ داروں کے ایک کنبے کے پاس بھیج دیا۔ وہ وہاں کچھ دن رہے۔ یہ کنبہ ٦٦ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلا گیا اور چرغنے کو ان کے والدین کی اجازت سے ساتھ لیتا گیا کسی طرح یہ حضرات ٧١ء کی خون ریزی سے بچ گئے۔ چراغ علی پر بچپن میں جو مونث آسیب عاشق ہوئی تھی شاید اس نے انہیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا اور ان پر انعام واکرام کی بارش کر دی۔ دراصل چراغ علی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ناسازگار حالات میں محنت اور دیانت ہی ایک شخص کے سب سے اچھے دوست ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ کامیاب رہے۔ صاف رنگ' مضبوط قد کاٹھی اور معقول ذریعہ معاش کی وجہ سے ان کی شادی ایک اچھے خاندان میں ہوگئی۔ ٥٩ء میں شیخ چراغ علی اینڈ سنز کا ایک پھلتا پھولتا کاروبار تھا اور 'اینڈ سنز' اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک اچھی شریک حیات نے گھر سنبھال رکھا تھا ایسے میں چراغ علی کو وطن عزیز کی یاد آئی۔ لوٹے تو سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے۔ کلائی میں بیش قیمت گھڑی تھی اور بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

پرانے شناساؤں میں شیخ شفاعت علی کے یہاں بھی پہنچے۔ محلے کا واحد پختہ مکان کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں پائیں باغ تھا وہاں چراغ علی کے ہی کچھ دور کے رشتے داروں نے قبضہ کر کے برش کا کارخانہ لگا لیا تھا۔ بزرگ مکین مرکھپ گئے تھے۔ جوان روزی روٹی کی تلاش میں باہر تھے۔ صرف ایک بزرگ خاتون جو چراغ علی کے بچپن میں نوجوان لڑکی تھیں' باقی رہ گئی تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ مع اپنے نالائق لڑکے' اس کی پانچ اولادوں اور بہو کے ساتھ کھنڈر پر دعوی ٹھوک کر آن بسی تھیں۔ خاصی ریسرچ کرنے کے بعد چراغ علی نے آ کر ایک بچے سے کہا۔

''بیٹا جاؤ' اندر کہہ دو کہ شیخ چراغ علی آئے ہیں۔''

لڑکے نے باہر آ کر جواب دیا ''دادی کہہ رہی ہیں ابا نہیں ہیں' پھر آئیو۔''

انہوں نے فرمایا ''کہہ دو آپ کی بھی قدم بوسی چاہتے ہیں۔''

وہ کچھ حیران سی ہو کر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے آن کھڑی ہوئیں۔ ''کون ہے؟ ہم سے ملنے کون آیا؟''

''خالہ، ہم ہیں چراغ علی۔''

''کون چراغ علی؟''

''زمانہ پہلے ہمارے ابا کوئی آٹھ سات گھر چھوڑ کر رہا کرتے تھے۔ اللہ رکھا صاحب۔ ہم ان کے بیٹے ہیں۔ آپ اکثر ہم سے دوپٹے رنگنے کو رنگ منگوایا کرتی تھیں اور ابرق۔''

انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجہ بنایا۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر اس کی دراز سے باہر جھانکا تو ذہن میں کھد بد کھد بد کچھ پکا۔

''ارے کم بخت یوں کیوں نہیں کہتا چرغنا ہے۔'' وہ پردہ ہٹا کر یوں باہر نکل آئیں کہ ایک قدیم عادت کے تحت پیٹھ پر دھول جمانے کو ہاتھ اٹھا ہوا تھا لیکن ایک لانبے، مضبوط، ادھیڑ عمر، خوش لباس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں۔

اس کے چہرے پر چراغ روشن تھے اور پل کے نیچے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

آجا، آجا، اندر آجا، چل بیٹھ، انہوں نے پھٹیچر سا مونڈھا سرکایا۔ کچھ دیر بعد درار پڑی پیالی میں اونٹی ہوئی چائے دو کھڑ کھڑے بسکٹوں کے ساتھ پلائی۔ نام بنام سب کی خیریت پوچھی۔ چلتے وقت پانچ روپے کا مڑا تڑا نوٹ نکال کے دیا ''بچوں کے لئے کچھ لیتے جائیو۔'' شیخ چراغ علی نے وہ مڑا تڑا کثیف نوٹ اپنے چمڑے کے بیش قیمت بٹوے میں سو سو کے نوٹوں کے درمیان رکھا اور سلام کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دل میں کہیں ایک ٹیس سی اٹھی۔ جب بھی ان کی والدہ اس ڈیوڑھی پر سلام کرنے کو حاضر ہوتیں، بچوں کے ہاتھ میں ایک آدھ مٹھائی کا ٹکڑا دیا جاتا یا بسکٹ۔ چلتے وقت دوّنی چونی جیسی رقم ضرور عطا کی جاتی۔ روایت برقرار تھی۔ (کہانی کے پہلے نصف حصے کے راوی احمد صدیق، پروفیسر شعبہ قانون، دہلی یونیورسٹی کا انتقال ہو چکا ہے دوسرے حصے یعنی چراغ علی کے شناسا سید شفیع الزماں کا سایہ ان کے اہل وعیال پر قائم ہے)

تو چونکہ بہت سی روایتوں کے برقرار رہنے کے باوجود پل کے نیچے بہت سا پانی بھی بہہ

چکا تھا اس لئے محمود علی صاحب کی اہلیہ احمد حسین وارثی رنداف کی اہلیہ کے ہاں میلاد میں تشریف لے گئیں۔

ربیع الاول کے مہینے میں میلاد محمود صاحب کے یہاں بھی ہوتا تھا۔ رشتہ داری' تعلقات' سب طرف کی عورتیں جمع ہوتیں سال بھر سے بند کرم خوردہ مولود سعیدی یا میلاد اکبر کو جھاڑ پونچھ کر نکالا جاتا۔ ثناء اللہ کی اہلیہ (جو عرف عام میں دروغائن کہلاتی تھیں) کو جھوم جھوم کر پاٹ دار آواز میں میلاد و سلام پڑھنے اور میاں کی رشوت کی کمائی میں ملے نوٹوں کی گڈیاں جھاڑ جھاڑ کر گدوں کے اندر چھپا کر رکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

ثناء اللہ عثمانی ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچ کر حال میں رٹائر بھی ہو چکے تھے لیکن بیوی کے ساتھ لفظ دروغائن چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ ایسا برا بھی نہ مانتیں۔ عزیزوں' رشتہ داروں اور دوست احباب' کسی کے گھر زنانہ میلاد ہوا تو میلاد خوانی کے لئے انہیں ہی مدعو کیا جاتا لیکن ادھر میلاد پڑھ' دوہرا حصہ سنبھال، وہ موٹر میں چڑھتیں اور ادھر گھر والے و بقیہ حاضرین ان کی بخیہ ادھیڑنی شروع کرتے۔

''سنا ہے ایک فلیٹ' گلستان میں بھی بک کیا ہے۔''

''بڑی مہنگی عمارت ہے وہ تو۔ علاقے کے دام ہیں۔'' آواز میں رشک نمایاں تھا۔

''رٹائر ہوتے ہوتے اتنا کما لیا کہ اگلی دو تین پشتیں آرام سے کھا سکیں۔ مکان دیکھا ہے علی نگر والا؟''

''یہ تو جب داروغہ تھے تب ہی چھوٹ کر کما رہے تھے۔ ڈی ایس پی ہو گئے وہ بھی ٹریفک میں اس کے بعد سے تو وارے نیارے——''

''سب دیکھ رہے ہیں بھائی۔ لڑکوں کو ڈونیشن والے کالجوں میں پڑھا رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر' باقی دو انجینئر۔ ہمارے لڑکے بے چارے پڑھ پڑھ کے مر گئے لیکن مقابلے کا امتحان کلیئر نہیں کر سکے۔''

''اجی ڈونیشن کی بات چھوڑیئے۔ وہاں تک تو جائز ہے۔ انہوں نے، اور کئی اور لوگوں نے تو مقابلے کے امتحانوں کو دولت کے بل بوتے پر پھوڑ لیا۔ وہ کیٹ (CAT) والا

ہنگامہ نہیں یاد؟ بس دو تین سال ہی تو ہوئے۔''

''رنجیت ڈان والا؟''

''ہاں صاحب سی بی ایس ای اور کیٹ کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اب لوگ لاکھوں دے کر کسی لائق امیدوار کو دھکا دے کر اپنے بچوں کو اس کی سیٹ پر لے آتے ہیں۔''

''بیٹی کی شادی فائیو اسٹار ہوٹل سے کی۔''

''لوگ اللہ سے ڈریں نہ عاقبت سے''

''لے' آخرت سے کیا ڈرنا۔ اب ڈی ایس پی صاحب مع دروغائن حج کرنے جا رہے ہیں۔ داڑھی بھی چھوڑ چکے ہیں۔ گناہ ثواب کا پلہ برابر ہو جائیگا۔ جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔''

''نہ کھلے تو وہاں بھی رشوت دے دیں گے۔ یہاں لیتے آئے تھے' وہاں دے کے چھوٹ جائیں گے۔''

(یہ کمنٹ زہرا کا تھا۔)

''اجی تم کون سی اللہ رسول سے ڈرو ہو۔ یہ نئی نسل دیدے کی صاف' زبان کی تیز۔ لو داروغہ جنت کو رشوت خور ٹھہرا دیا۔''

گفتگو کا رخ نئی نسل کی طرف پھر گیا۔ زہرا وہاں سے سٹک لی۔ چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

دروغائن کو فخر تو تینوں بیٹوں پر تھا لیکن ڈاکٹر بیٹے پر انہیں خصوصی گمان تھا۔ زیادہ تر اچھے گھروں کے لونڈے واہی تباہی' ڈنڈے بجاتے گھوم رہے تھے اور نیچ ذاتوں کو عروج حاصل تھا۔ ان کا کنبہ ان چند کنبوں میں تھا جہاں بیٹی تک نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پونا کی ایک درسگاہ میں بھاری عطیہ دے کر اسے ایم سی اے کرایا گیا تھا۔ تعلیم کے دوران ہی رشتہ پکا ہو گیا تھا اور رٹائر ہونے سے چند ماہ قبل دروغائن کے ڈی ایس پی شوہر نے اس کی شادی کر دی تھی جس کا خاصہ چرچا رہا تھا۔ اب بڑے لڑکے کی باری تھی۔ رشتے تو بہت آ رہے تھے لیکن دروغائن کو ڈاکٹر کے لئے زہرا بہت پسند تھی اور اس کا عندیہ وہ ظاہر کر چکی تھیں جس

پر محمود علی ایکزیکٹیو انجینئر کی بیوی دبی دبی خوشی کا اظہار کر چکی تھیں ۔ شادی کے بازار میں ڈاکٹر کا بھاؤ بہت تیز تھا۔ اگر ڈاکٹر کی ماں از خود لڑکی پسند کرے تو سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ ابھی لمبی داڑھی والے متین خاں نے بیٹے کی شادی میں ایک فلیٹ اور گاڑی کا مطالبہ کیا تھا۔

لمبی داڑھی و لمبی گاڑی۔

متین خاں محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے (اوورسیئر حضرات آج کل جونیئر انجینئر کہلاتے ہیں) کمانے کی گنجائش تھی ۔ خوب کمایا بھی ۔ رٹائر ہونے کے بعد خدا یاد آیا اس لئے کہ خدا سے ملاقات ہونے کا وقت قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی داڑھی پہلے سے تھی اسے انہوں نے کچھ اور بڑھا لیا۔ اب ٹھڈی نیچے کرتے تو داڑھی سینہ چھوتی ۔ مسجد میں درس قرآن شروع کرایا اور مرمت کے لئے بھاری عطیہ بھی دیا۔ مزید ترقی ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے رکن بن گئے ۔ بیٹا ایک ہی تھا اور تھا ہونہار ۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ کلاس ٹو گورنمنٹ پوسٹ مل گئی جو آگے چل کر یقینی طور پر کلاس ون میں تبدیل ہونے والی تھی ۔لڑکی والے فیصلہ کن بات چیت کے لئے آئے تو عام سا سوال پوچھا'' بھئی کوئی مطالبہ ہو تو پہلے بتا دیں ۔'' والد صاحب کہنے لگے فی الحال تو مغرب کے لئے مسجد جا رہا ہوں۔ پھر گشت میں نکل جاؤں گا۔ میرا کیا مطالبہ ہو سکتا ہے ۔ جو ہے وہ اسی سے ہے۔ انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ۔ ہاں لڑکوں اور والدہ سے پوچھ لیجئے ۔لڑکوں میں ایک تو صاحب معاملہ تھے ۔ دوسرے بڑے صاحبزادے تھے جو شادی شدہ تھے ۔

کافی دیر آئیں بائیں شائیں کے بعد اندر سے کہلایا گیا کہ لڑکے کو فورو ہیلر دی جائے ۔ لڑکی والے مان گئے ۔ اتنی بساط تھی ان کی ۔ دوسرے دن صبح ایک اور فون آیا۔ اب بھائی گاڑی دیں تو ذرا ایسی دیجئے گا کہ حال کلاس ٹو اور مستقبل کلاس ون افسر کے مرتبے سے میل کھاتی ہوئی ہو ورنہ جسے دیکھئے وہ ٹچی سی ماروتی 800 لئے گھوم رہا ہے ۔ سچ پوچھئے تو اب یہ لونڈوں کو دی جاتی ہے کہ لو، شہر کی سڑکیں ناپو بعد میں بڑی بھی لے لینا۔

'' ہمارے لئے پیغام آنے لگے ہیں صاحب ۔ ذرا ہوشیار ہو جایئے ۔'' زہرا نے

شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لئے بھی۔'' ایاز نے نہایت سنجیدگی سے گھاس کا تنکا توڑتے ہوئے کہا۔

''تنکے کیوں چننے لگے؟''

''اسلئے کہ آپ ان پیغامات پر جو آپ کے لئے آ رہے ہیں اتنی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔''

''احمق ہیں آپ۔''

''وہ تو اسی دن قرار پائے جس دن دل آپ کی نذر کیا۔''

''یہ بے بضاعت سی شئے لے کر ہم کیا کریں گے۔ واپس لے لیجئے۔''

''چلئے واپس لیا۔''

زہرا سچ مچ ناراض ہوگئی۔ ''اب کیا میرے نکاح میں گواہ بننے کا ارادہ ہے؟''

''تو کیا کریں۔ آپ کے ابا آپ کے دادا کی چھڑی لے کر دوڑا لیں گے۔ چھڑی کی موٹھ چاندی کی ہے۔ زور سے لگے گی۔''

''سید زادی سے شادی کرنے کے لئے دو چار چھڑیاں کھالینا ایسی کوئی بات نہیں۔ اگلی نسل سدھر جائے گی۔''

''محترمہ نسل باپ سے چلا کرتی ہے۔ آپ کے یہاں بھی مادری نظام رائج نہیں ہے۔''

''اجی چھوڑیئے۔ نسل اس سے چلتی ہے جس کا پلہ بھاری ہو۔ ہمارے ہردلعزیز راجیو گاندھی' نہرو کے نواسے ہی کہلاتے رہے۔ ان کے والد کا نام تو ضرور معلوم ہے دادا کا بتا دیں تو ابھی آپ کو سونے کا تمغہ دے دیں ہم۔''

ایاز نے سر کھجانا شروع کر دیا۔ ''سید زادی ہونے کا خاصہ زعم آپ کو بھی ہے جبکہ حضور ﷺ نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ اس زعم میں نہ رہنا کہ رسول کی بیٹی ہو، روز آخرت تمہارے اعمال تمہارے ساتھ اور میرے اعمال....''

''اور حضور نے یہ بھی فرمایا تھا۔'' زہرا نے مصرع اٹھانے کے انداز میں بات کاٹ کر

آگے کہنا شروع کیا۔۔۔ ""تم میں سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔۔۔"

"نہ کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر۔۔۔"

"نہ عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر۔۔۔ مگر ایاز صاحب ہم سے شادی کر لیجئے گا تو بچے خم ٹھوک کر اپنا نام بتائیں گے۔۔۔ مثلاً بیٹے کا نام کیا رکھیں گے آپ؟"

"فرض کیجئے کیقباد احمد وارثی۔۔۔"

"یہ کیقباد کیا ہوا؟ واہیات نام ہے۔"

"یہ نہایت مدبر رعایا پرور سلجوق سلطان تھا۔ کچھ مورخین نے تو اسے کیقباد دی گریٹ کہا ہے۔"

"کہا ہو۔ یہ سید کیقباد دی گریٹ احمد وارثی چلے گا نہیں۔"

"تو کوئی اور ذریعہ نکالئے کہ ہم اپنا سلسلہ نسب یا عرب سے جوڑ سکیں یا سینٹرل ایشیا سے خواہ ہم وہاں فوج میں گھوڑوں کی لید سمیٹنے پر کیوں نہ مامور رہے ہوں۔"

"یا راہزن بدوؤں کی جماعت میں ہوں۔"

"یہ تمہارا احساس کمتری بول رہا ہے۔"

"زہرا' کیا تم سنجیدہ ہو؟" ایاز کے لہجے میں خفیف سی دھار تھی اور کچھ حیرت بھی۔

زہرا دہشت زدہ ہو گئی۔ فار گاڈ زسیک ایاز! اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پارک میں آس پاس کوئی دکھائی نہیں دیا صرف ایاز کی موٹر سائیکل چمک رہی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسوں کو اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ "آئندہ ایسا نہ کہنا نہ سوچنا۔ میں جس مرد مومن کے ساتھ اپنی باقی ساری زندگی گذارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اس سے زیادہ عظیم میری نظروں میں کوئی نہیں" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور ہاں اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔ "تم شوق سے ہمارے بیٹے کا نام کیقباد رکھنا۔ مجھے تمہاری کسی بات پر کبھی اعتراض نہ ہو گا۔" اس بار اس کی آواز مسکراہٹ سے روشن تھی۔

"احمق الذی" ایاز نے اسے تیزی سے اور قریب کر لیا "کیقباد کی اماں! کیا ڈوس کیسا رہے گا؟ نہیں تو پھر اریق بوغا یہ سارے سینٹرل ایشیا کے گھاس کے میدانوں کی خوشبو میں

بسے ہوئے نام—"

زہرا نے اس کے پورے چہرے کو اپنے ہاتھ سے ڈھک کر زیرلب کہا" پاگل کہیں کے۔"

"گھر میں بیری ہو تو ڈھیلے آتے ہی ہیں لیکن ایسا بے ڈھب ڈھیلا! منھ اٹھائے سید زادی کا ہاتھ مانگنے چلے آئے۔" زہرا کی والدہ اہلیہ محمود علی نے آموں کے ٹوکرے کو زور کی لات ماری جو ایاز کی امی نے بھجوایا تھا۔ بہترین، تازہ اور چنندہ گلاب خاص اور دسہری فرش پر لڑھک گئے۔ کچھ دیر وہ غصے میں تن پھن کرتی رہیں پھر ملازمہ سے کہا کہ آم اٹھا کر ٹوکرے میں رکھ دے اور ان کے یہاں واپس پہنچا آئے۔ آموں کا ٹوکرا بطور سوغات انہوں نے سویرے ہی بھجوادیا تھا جو پڑوسی کی طرف سے دوستی اور منکسر المزاجی کا مظہر سمجھ کر قبول کرلیا گیا تھا۔ لیکن سہ پہر کو ایاز احمد وارثی کی والدہ خود تشریف لے آئیں اور ابتدائی گفتگو کے بعد پرس سے ایک کاغذ برآمد کیا۔

"پہلے رقعے چلا کرتے تھے جو مشاطہ لاتی تھی۔ اب یہ ہے بایوڈاٹا۔ وہ بھی ابا اماں کو اکثر خود ہی دینا پڑتا ہے۔" وہ ہنس کر بولیں (ویسے اندر سے چھوٹا منھ بڑی بات تو اچھی طرح محسوس کررہی تھیں۔ بیٹے کی محبت میں اس امکان پر غور کرکے آئی تھیں کہ انہیں اہانت کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے)

کیا مطلب؟ اہلیہ محمود حسین واقعی کچھ سمجھ نہیں سکیں۔ اسکا تو انہیں سان وگمان بھی نہیں تھا کہ یہ زہرا کے لئے پیغام ہوسکتا ہے۔

"ہم زہرا بٹیا کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر ایک دم سے بول پڑیں کہ کہیں زیادہ ہکلائیں تو شاید ہمت ٹوٹ جائے اور اٹھ کر بھاگ جائیں۔

زہرا بٹیا کی اماں نے انہیں یوں دیکھا جیسے وہ ہذیانی کیفیت کے تحت کچھ کہہ رہی ہوں۔

"ہمارا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ سرجری میں اسپشیلائز کررہا ہے۔ مقابلے کا امتحان دیا تو پہلی

مرتبہ ہی کامیابی ملی ۔ ایم بی بی ایس میں بھی اور اب بھی' سولہ ہزار تو اس کورس کے دوران ہی مل رہے ہیں ۔صورت تو آپ نے دیکھی ہی ہے ۔ گورا' لانبا' سعادت مند' نیک مزاج ۔''
بیٹے کے خواص بیان کرتے وقت وہ ہکلانا بھول چکی تھیں اور خم ٹھوک کر بات کر رہی تھیں ۔
اہلیہ محمود حسین نے انہیں شرارے برساتی نظروں سے گھورنا چاہا لیکن ضبط کر گئیں ۔ ملازمہ چائے کی ٹرے لا چکی تھی ۔ جی تو چاہ رہا تھا اس گستاخ عورت کو اسی وقت نکال باہر کریں لیکن وہ گستاخ عورت پڑوسن تھی اور پھر صبح آموں کا ٹوکرا قبول کر چکی تھیں ۔ مزید ضبط وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے چائے کی پیالی بڑھائی اور ناشتے کی پلیٹ بھی لیکن چہرے کا رنگ بدل چکا تھا جو ایاز کی پڑھی لکھی ماں پر ضائع نہیں جا رہا تھا ۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں ۔

''جواب کا انتظار رہے گا ۔''

''جواب کا انتظار نہ کریں ۔ شادی کفو میں ہی کی جاتی ہے''

''کفو تعلیم' رہن سہن کے معیار اور خاندان کے لوگوں کے کردار سے بنتا ہے ۔ ان تمام باتوں کے لحاظ سے آپ ہمیں کفو سے باہر نہیں پائیں گی ۔''

دریدہ دہنی کی انتہا ہو چکی تھی لڑکی کی اماں غصے سے گنگ' اٹھ کر اندر چلی گئیں ڈاکٹر ایاز احمد وارثی کا بایوڈاٹا کچھ دیر میز پر پڑا پھڑ پھڑاتا رہا ۔ پھر ہوا سے اڑ کر آنگن میں چلا گیا جہاں سے ملازمہ نے اٹھا کر اسے کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا ۔

بایوڈاٹا کچھ یوں تھا:

عمر ۔ ۲۷ سال

تعلیم ۔ ایم بی بی ایس' گولڈ میڈلسٹ (ایم ۔ ایس)

قد ۔ ۵ فٹ ۱۸ انچ' وزن ۵۸ کیلو

رنگ ۔ گورا

شوق ۔ کرکٹ' ادبی کتب کا مطالعہ

ذات ۔ نداف (روئی دھننے والے محنت کش انسان)

مذہب۔ سنی مسلمان
مزاج۔ ہنس مکھ، بزلہ سنج، دائرہ اسلام کے اندر رہ کر جدید اقدار میں یقین
والد۔ ایڈووکیٹ، ہائی کورٹ
والدہ۔ بی اے پاس۔ ہاؤس وائف
مستقبل۔ نہایت روشن

رات کو اہلیہ محمود علی نے محمود علی صاحب سے کہا۔ دروغائن بہت صاف اشارہ کر چکی ہیں آپ یا تو زہرا کی بات آگے بڑھایئے ورنہ کسی دوسرے رشتے پر غور کیجئے۔''

''یہ اچانک آپ کو زہرا کی شادی کی کیا سوجھ گئی۔ ابھی وقت باقی ہے۔''

انہوں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بولیں ''دروغائن کے یہاں کا رشتہ ہے بہت مناسب۔ ذات رات کا کچھ پوچھنا نہیں، جانے بوجھے لوگ ہیں۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔''

''ہوں.... سوچا تو جا سکتا ہے۔ لیکن لڑکا ــــ''

''لڑکے میں کیا خرابی ہے؟''

''قد کم ہے زہرا کے حساب سے اور سنا ہے ــــ''

وہ بھڑک گئیں۔ اب فیتہ لے کے لڑکے ناپتے پھریے گا۔ اور یہ جو سنا ہے کہ میڈیکل میں داخلہ پیسہ کھلا کے ہوا تو سب کا ایسے ہی ہو رہا ہے۔ لاکھوں لڑکے بیٹھتے ہیں ان میں سے آپ نے محض ڈیڑھ دو ہزار لئے تو باقی کہاں جائیں گے۔ سب ناکارہ نالائق ہی ہیں کیا؟''

''میں اس موضوع پر بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ہے نہ۔ آگے آیت۔ سنا یہ ہے کہ ان لوگوں کا مطالبہ بھی ہے اب اگر ہماری بساط سے زیادہ مانگ بیٹھے؟''

''زہرا ایم سی اے کر رہی ہے خود کما کر لائے گی انہیں پسند بھی ہے زیادہ وہاں مانگیں گے جہاں لڑکی کم تر ہو۔'' لڑکی کی شادی کی بات وہ بھی ماں کے منہ سے کوئی انوکھی تو نہیں لیکن جس لہجے اور جس اچانک طریقہ سے اٹھائی گئی تھی اس سے محمود علی صاحب کچھ کھٹک ضرور رہے تھے۔

''کیا دروغائن نے کچھ کہلایا ہے؟''

''در وغائن نے ابھی ادھر تو کچھ نہیں کہا لیکن آپ کے بھائی صاحب جن لوگوں کو ہمارے سر پر مسلط کر گئے ہیں وہاں سے زہرا کے لئے پیغام لے کر لڑکے کی والدہ آ کر بیٹھیں۔ ادھر میں نے زہرا میں کچھ تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔ میرا تو شام سے دماغ خراب ہو رہا ہے۔''

''کیا؟'' محمود علی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً انہیں کسی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اور کسی کی کیا تمہاری بیٹی کی ہی ہوگی۔ ذرا پوچھنا تو کل اس سے''

''میری بیٹی کا نام مت لیجئے۔ آپ کے بھائی صاحب نے ہشکایا ہوگا۔ جب وہ انہیں اس لائق سمجھ سکتے ہیں کہ اپنا مکان ان کے ہاتھ بیچ جائیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیغام بھیجو آخر تم میں کیا کمی ہے۔ محمود علی خاموش ہو گئے۔ شاید بیوی سچ ہوں۔ مگر کل اس زہرا کی خبر تو ضرور لینی ہے۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ زہرا کا ادھر ہر جمعے کو اکسٹرا کلاس ہونے لگا تھا وہ سویرے ہی تیار ہو کر نکل چکی تھی۔ جمعہ کی نماز کو جاتے ہوئے محمود علی صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ شام کو سہی ذرا لڑکی سے پوچھنا ہے کہ کیا گل کھلا رہی ہے اور اتوار کو پہلی فرصت میں ڈی ایس پی صاحب سے مل کر رشتہ پکا کر دینا ہے۔

سوچ میں گم محمود علی نے نظریں گھمائیں۔ ایاز آج بھی ان کی صف میں ان کی بغل میں کھڑا تھا۔

باقی سر

پچھلے کچھ برسوں سے شہر میں اونچی اونچی عمارتیں اگ آنے کا ایک سلسلہ سا ہو گیا تھا۔ اکثر یاد بھی نہیں رہ جاتا تھا کہ پہلے یہاں کیا تھا۔ ایک معمولی آدمی کا معمولی لیکن کشادہ آنگن والا مکان یا امرودوں کا باغ یا ٹین کے شیڈ والی دو کانوں کی قطار۔ لیکن پروفیسر دانش علی رضوی کو، جو اپنا کریر بطور اسکول ٹیچر شروع کرنے کی وجہ سے عرف عام میں 'دانش ماس ساب' کہلاتے تھے، خوب یاد تھا کہ جس عمارت کے ڈی لکس فلیٹ میں رہ رہے تھے، وہاں پہلے کیا تھا۔

وہ ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ شام کو بچے وہاں فٹ بال کھیلتے یا گلی ڈنڈا۔ لڑکیاں گھیرے برگد کی مضبوط شاخوں میں جھولا ڈالتیں۔ سال کے سال وہاں ایک نمائش لگتی، مشاعرے اور سیرت النبی کے جلسے ہوتے، اور تو اور ایک مرتبہ وہاں نہرو جی کی تقریر بھی ہوئی تھی۔ یہ پچاس کی دہائی کی ابتدا تھی اور آزادی ملے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

میدان کہلانے والا یہ قطعہ زمین شہر کے رئیس رائے بہادر رام کھلاون سکسینہ کی ملکیت تھا اور ایک طرح سے ان سب کاموں کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ رائے بہادر صاحب کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں میں بہت بڑی جائداد تھی اور شہر میں نہایت خوبصورت، وسیع و عریض کوٹھی۔

ایک دن ان کے پاس مسیں بھیگتا، کرتے پاجامے میں ملبوس ایک شریف صورت لڑکا وارد ہوا۔ ''جناب سے ایک درخواست ہے۔'' نہایت ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ لہجے میں لجاجت تھی لیکن خوشامد قطعی نہیں۔

حواریوں مواریوں کے درمیان گھرے سکسینہ صاحب اس وقت پائیں باغ میں بیٹھے حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ منہ سے پائپ نکال کر انہوں نے دھواں چھوڑا اور ایک گہری نظر لڑکے پر ڈالی۔ آئے دن کسی نہ کسی اعانت کی درخواست لے کر جو لوگ چلے آیا کرتے تھے ان کا حلیہ بشرہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ لیکن اس لڑکے کی خود اعتمادی اسے اوروں سے ممتاز بنا رہی تھی۔

''کہئے میاں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا

''ہم نے یہاں ضلع اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ لیا ہے۔ جونیئر ہائی اسکول کا امتحان پرائیوٹ پاس کر کے آ رہے ہیں۔ کچھ دن گاؤں کے اسکول میں بھی پڑھا تھا۔ والدین کی استطاعت نہیں کہ شہر میں رکھ کر تعلیم کا خرچ اٹھا سکیں۔''

وہ اس قدر آہستہ بول رہا تھا کہ سکسینہ صاحب سے صبر نہ ہو سکا۔ ''ٹھیک ہے دیکھیں گے کیا کر سکتے ہیں'' انہوں نے اسی سانس میں منشی جی کو بلانے کا حکم دیا۔

''قطع کلام ہوتا ہے جناب لیکن ہم آپ سے مالی امداد کے طالب نہیں ہیں۔''

''پھر؟'' رائے بہادر صاحب چونکے

''ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں کہ شام کو آپ کے میدان کی زمین کے ایک گوشے میں ٹیوشن پڑھا لیا کریں۔'' اس مرتبہ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ ''جونیئر ہائی اسکول میں ہم نے فرسٹ ڈویژن حاصل کیا ہے اور ڈسٹرکٹ میں چوتھی پوزیشن۔ ہمیں آٹھ روپے ماہوار وظیفہ مل جائے گا۔ ہم چھوٹے بچوں کو اردو، انگریزی، حساب، ہسٹری، ہندی، جغرافیہ سب پڑھا سکتے ہیں۔''

رائے بہادر صاحب نے پائپ سامنے رکھی بلوری ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اس سے قبل میدان میں (جسے وہ نہرو جی کی تقریر کے بعد سے جواہر میدان کہنے پر مصر تھے اور اس نام کا

بورڈ بھی وہاں لگوا چکے تھے) کسی ایکٹیوٹی کیلئے کسی نے ان سے کوئی اجازت نہیں چاہی تھی ۔ بس نمائش لگانے والے آ کر تاریخ کی اطلاع اور کرایے کی رقم دے جایا کرتے تھے ۔ یہ واحد مالی منفعت تھی جو اس زمین سے تھی وہ بھی ان کے لئے کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی ۔

''میاں' آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''عبدالباقی جناب والا۔''

''تو میاں عبدالباقی جناب والا''

لڑکا گھبرا گیا'' جناب وہ تو ہم نے آپ کے لئے کہا تھا جناب والا... ہمارا نام صرف عبدالباقی ہے۔''

''جایئے' آپ کار خیر کیجئے ۔'' رائے بہادر رام کھلاون سکینہ کے چہرے پر لڑکے کی گھبراہٹ سے محظوظ ہونے والی کیفیت کے آثار تھے ۔ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے بات جاری رکھی ۔'' استاد اگر اپنی خدمات کا معاوضہ لیتا ہے تو بھی وہ کار خیر انجام دیتا ہے ۔ اس میں ہمارا پورا تعاون رہے گا انشاء اللہ ۔ آپ اپنے لئے ایک گوشہ منتخب کر لیں ۔''

پرانے برگد کے گرد رائے بہادر صاحب نے جو چبوترہ بنوادیا وہ دانش علی کے سامنے بنا تھا ۔ تب ان کی عمر کوئی سات آٹھ برس تھی ۔ وہ گھر پر مولوی صاحب سے پڑھا کرتے تھے ۔ قرآن ختم کر چکے تھے اردو کی کتاب 'ابر رحمت' کا تیسرا حصہ پڑھ رہے تھے اور والدین کو اب شد و مد سے ان کی با قاعدہ تعلیم شروع کرانے کا خیال آ رہا تھا جس میں سبھی مروجہ مضامین شامل ہوں ۔ اس لئے چبوترے پر جو پہلا ٹاٹ بچھا 'باقی ماٹ ساب' نے جو پہلا سبق پڑھایا اور جن چار طالب علموں نے وہ کلاس ''اٹنڈ'' کیا ان میں دانش علی بھی شامل تھے ۔ اس وقت شہر میں کوئی بچہ ڈھائی تین برس کی عمر میں آنکھیں ملتا' مرغے کی طرح پھڑ پھڑاتا' ٹانگیں چلاتا ہوا' پکڑ کر اسکول نہیں بھیجا جاتا تھا ۔ چھ سے آٹھ برس کی عمر کے ان بچوں کی تعداد میں وقت گذرنے کے ساتھ اضافہ ہوا ۔ 'باقی ماٹ ساب' دن میں ضلع اسکول خود پڑھنے جاتے اور شام کو ان بچوں کو پڑھاتے ۔ دس بچوں کے بعد انہوں نے مزید بچے لینے بند کر دیئے تھے ان کا کہنا تھا کہ اس سے بڑی تعداد کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر سکیں گے ۔ بعد میں ان بچوں کو

والدین نے ضلع اسکول میں داخلہ دلوایا۔کوئی تیسرے میں لیا گیا کوئی چوتھے پانچویں میں۔ داخلے کا امتحان سب نے پاس کیا۔زیادہ تر بچے اسی طرح اسکول بھیجے جاتے تھے۔ضلع اسکول' خواص کے لئے تھا اور سب سے زیادہ مقبول۔'پری پرائمری' کسی اسکول میں نہیں تھا بلکہ لوگ اس تصور سے ہی ناواقف تھے۔انگریزی پانچویں جماعت سے شروع ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ گذرا۔ نئے بچے آئے کچھ پرانے بچوں نے ضلع اسکول میں داخلے کے باوجود ٹیوشن جاری رکھی۔زیادہ تر لڑکے انگریزی اور حساب میں مدد چاہتے تھے۔باقی ماٹ ساب نے اب انگریزی بھی شروع کرادی۔کورس میں مبتدیوں کی آوازیں بلند ہوئیں:

''سی۔اے۔ٹی' کیٹ' کیٹ معنی بلی' آر۔اے۔ٹی ریٹ' ریٹ معنے چوہا...''

دانش رضوی اکثر ٹیوشن پڑھنے کے بعد بستہ لٹکائے تختی جھلاتے واپس لوٹتے تو لین صاحب کی دبلی پتلی گوری سی بٹیا کامنی دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی۔اس پر نظر پڑتے ہی دانش میاں زور زور سے ورد کرنا شروع کرتے: سی۔اے۔ٹی کیٹ' کیٹ معنی بلی.....کامنی کا دروازہ گذر جاتا تو بھی ان کا ورد جاری رہتا۔کم از کم اتنی دور تک تو ضرور جہاں سے آواز پیچھے کا سفر کر کے لین صاحب کے دروازے میں داخل ہو سکے۔کامنی کا گورا' گلابی چہرہ سرخ ہو جاتا وہ اندر سٹک لیتی لیکن دانش کے وہاں سے گذرتے وقت' شام کے جھٹپٹے میں ادبدا کے باہر ضرور آجاتی۔(بھلا پوچھو کیوں کھڑی ہوتی تھی وہ۔نہ ہوتی تو اس کا کیا چلا جاتا؟ نہ جانے کتنی بار دانش رضوی نے اپنی زندگی میں یہ بات سوچی تھی)

لین صاحب کا نام رام گوپال شرما تھا۔وہ ریلوے میں لائن انسپکٹر تھے۔نوکری میں آنے سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک بھی' یقیناً اپنے نام سے پکارے جاتے ہوں گے لیکن پھر وہ لین انسپکٹر اور اس کے بعد کے تدریجی ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد لین صاحب کہلانے لگے۔وہ چھوٹے شہر کے ان کھلے دماغ والے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے عرصہ قبل لڑکیوں کو تعلیم دلانا ضروری سمجھا تھا اور کم از کم ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ کرادینے کے بعد ہی ان کی شادی کی سوچتے تھے اس لئے باقی ماٹ ساب کامنی کو بھی ٹیوشن پڑھاتے تھے لیکن کامنی برگد تلے کی کلاس میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ماٹ ساب کو اس کے گھر جانا پڑتا تھا۔گھر

جا کر پڑھانے کی فیس پانچ روپے ماہوار تھی۔ وہ حکیم عبدالعلی کی بیٹی نور فاطمہ کو پڑھانے بھی اس کے گھر جایا کرتے تھے لیکن وہاں نور اور ان کے درمیان ایک پردہ کھینچ دیا جاتا تھا۔ نور کی عمر محض گیارہ برس تھی۔ وہ ان سے حساب اور اردو کا درس لیتی تھی۔

ساری لگائی بجھائی اسی فتنی نور فاطمہ کی تھی۔ نور اور کامنی ہم عمر ہی نہیں، گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں ہم جماعت بھی تھیں۔ نور کی بارہویں سالگرہ ہوئی تو حکیم عبدالعلی کی والدہ یعنی نور کی دادی نے حسب دستور میٹھے چاول پکا کر ان پر نیاز دلوائی۔ لیکن اس بار میٹھے چاولوں کا نوالہ نور کے منہ میں دینے سے قبل انہوں نے کہا۔

''اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ دھبڑ دھبڑ کر کے گلی محلے میں دوڑنا اور برگد میں جھولا جھولنا بند کرو۔'' سب کے ساتھ نور نے بھی تسلیم کرلیا کہ وہ اب بڑی ہوگئی تھی۔

ویسے دھبڑ دھبڑ تو وہ اب بھی دوڑتی تھی لیکن اسکول کے میدان میں اور کامنی کے گھر میں جہاں خاصہ بڑا پائیں باغ تھا۔ (فرصت کے اوقات میں سلیقے سے سر پر دوپٹہ اوڑھ کر سلّو بوا کو ساتھ لے کر اسے کامنی کے گھر جانے کی اجازت تھی) وہاں وہ دھبڑ دھبڑ دوڑتی ہی نہیں، چڑ پڑ اتنا بولتی کہ سب عاجز آ جاتے۔ تبھی پائیں باغ کے ایک گوشے میں دوپٹے کے آنچل میں بیر بہوٹیاں اکٹھا کرتے وقت کامنی نے سرگوشیوں میں اسے بتایا کہ دانش اسکے گھر کے سامنے سے آتے جاتے اسے بلی کہہ کر چھیڑتا ہوا گذرتا ہے۔

(لیکن اس نے یہ قطعی نہیں بتایا کہ جس دن دانش کسی وجہ سے ادھر سے نہیں گذرتا تو وہ کتنی دیر تک دروازے پر کھڑی زور زور سے آتی سی۔ اے۔ ٹی کیٹ کی آواز کا انتظار کرتی اور پھر مایوس ہوکر سر جھکائے اندر چلی جاتی ہے)

پردے کے پیچھے بیٹھی، حساب کے سوال حل کرتی نور نے یہ اطلاع شکایت کی صورت باقی ماٹ ساب سے جڑ دی۔ اس وقت تک برگد تلے چلنے والے ٹیوشن کلاسز کو کئی سال ہو چکے تھے۔ اسی دوران میاں عبدالباقی نے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے پھر سے وظیفہ حاصل کیا تھا وہ اب بارہویں جماعت کی طالب علم تھے اور جلد ہی انٹرمیڈیٹ کے بورڈ زدینے والے تھے۔ عمر کے اٹھارہویں برس میں وہ ایک نہایت سنجیدہ اور بردبار ہستی بن

چکے تھے انہوں نے نور کی شکایت کو از حد سنجیدگی سے لیا۔
دانش بری طرح ہکلانے لگا تھا۔ ''ہم... ہم تو کیٹ کے ہجے اور معنی یاد کرتے ہوئے جا رہے تھے .... اور ہم... ہم نے خالی بلی تھوڑ ہی کہا تھا... ہم نے تو (یہاں پہنچ کر اس کی ہکلاہٹ دور ہو کر زبان میں نہایت روانی آ گئی تھی) ہم نے تو کہا تھا سی اے ٹی کیٹ' کیٹ معنی...''
کیٹ کے معنی سامنے آنے سے قبل باقی ماٹ صاحب نے دونوں کان پکڑ کر اتنی زور سے کھینچے کہ دانش کو لگا کہ کان اکھڑ کے ضرور ان کے ہاتھ میں رہ گئے ہوں گے (بعد میں وہ دیر تلک اپنے کان چھو چھو کر کے یہ اطمینان کرتا رہا کہ وہ اپنی جگہ برقرار ہیں تشویش کی کوئی بات نہیں)
'' آپ ہمیں پڑھاتے ہیں؟ عبد الباقی ماسٹر صاحب کو؟ ہم نے آپ کو بس اتنی ہی انگریزی سکھائی ہے؟ کیٹ معنی بلی اور وہ بھی ایسی کچی کہ راستے بھر مشق کرتے جائیں اور یاد نہ ہو؟ چلئے ادھر کھڑے ہو جایئے اور مرغا بنئے۔ ساتھ ساتھ سو بار کیٹ کے ہجے اور معنی دہرایئے تاکہ راستے میں یاد کرنے کی ضرورت نہ رہ جائے۔''
برگد کی چھتری کے جس کونے میں انہیں ماٹ ساب نے کھڑا کیا تھا ادھر کوؤں کا گھونسلہ تھا۔ بیٹ نے سر پر گلکاری کی پھر ماٹ ساب نے تختی پر کوئی پچاسی مرتبہ لکھوایا...''.اب ہم راستے میں انگریزی کی مشق نہیں کریں گے۔ خاموشی سے گھر جائیں گے۔'' چلتے وقت دھمکی ملی (سزا کی آخری قسط) '' آئندہ ایسی کوئی حرکت سنی گئی تو آپ کے والد صاحب اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب' دونوں تک شکایت جائے گی۔''
دانش علی کا پیشاب خطا ہوتے ہوتے بچا لیکن اس دن جب وہ لین صاحب کے گھر کے سامنے سے گذرے (کہ راستہ وہی تھا) تو خاموشی سے سر جھکا کر گذرنے کے باوجود انہوں نے آنکھوں کے گوشوں سے دیکھ لیا کہ کامنی حسب دستور وہاں کھڑی ہوئی تھی۔
پروفیسر دانش علی رضوی المعروف بہ دانش ماس ساب آج بھی یہ کہا کرتے تھے کہ اگر انہیں عبد الباقی سر نے میتھس نہیں پڑھایا ہوتا تو اس مضمون میں ان کی دلچسپی نہ پیدا ہوئی ہوتی

اوراس حدتک دلچسپی نہ پیدا ہوئی ہوتی تو وہ ان کے بس کا ہرگز نہ تھا۔ وہ میتھس میں ہوشیار نہ ہوتے تو فزکس نہیں پڑھ سکتے تھے اور اگر فزکس نہ پڑھی ہوتی تو کوچنگ انسٹی ٹیوٹس میں ان کی یہ ڈیمانڈ نہ ہوتی ۔ اور یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آج وہ اس عمارت کے ڈی لکس فلیٹ میں رہ کر اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں نہ پڑھا سکتے ۔ نہ ہی بیٹی سیما کی اتنی اچھی جگہ شادی کر سکتے جو سیما کی تعلیم اور ان کی عمدہ مالی حالت کے سبب ہوئی تھی ۔

عبدالباقی کو شہر کبھی نہیں بھول سکا۔ انہوں نے اپنی روایت قائم رکھتے ہوئے انٹرمیڈیٹ کا بورڈ کا امتحان بھی نہایت اعلیٰ نمبر لے کر پاس کیا۔ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ لے کر وہ اس شہر کے ضلع اسکول میں ماسٹر مقرر ہوئے پھر پرائیوٹ امتحانات پاس کرتے ہوئے وہ ہائر سکنڈری کلاس بھی لینے لگے لیکن ماسٹر عبدالباقی (جو اب عبدالباقی سر کہلانے لگے تھے) کی شہرت کی ایک وجہ اور بھی تھی ۔ انہوں نے ڈی ایس پی اور تحصیلدار صاحب کے نہایت شیطان بیٹوں کی سڑک پر پٹائی کر دی تھی اور ایسی پٹائی کی تھی کہ پھر وہ سدھر ہی گئے تھے ۔

اس دن انہیں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر سے ملنا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی ہدایت پر ان کا کلاس ایک دوسرے ماسٹر کے حوالے کر کے انہیں آفس روانہ کر دیا گیا۔ وہاں کہیں راستے میں یہ دونوں مٹر گشتی کرتے دکھائی دیئے ۔ باقی سر نے پہلے ذرا غور سے دیکھا تاکہ یقین ہو جائے کہ وہ کون ہیں ۔ لڑکے یونیفارم میں تھے یعنی گھر سے اسکول کے لئے ہی نکلے تھے انہوں نے ترچھی آنکھیں مزید ترچھی کیں اور رکشے سے کود پڑے ۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پیٹ کے رکھ دیا پھر کھینچ کر اپنے ہی رکشے پر سوار کرالیا۔ خود آفس پر اترے اور رکشے والے کو کرایہ دے کر کہا کہ لڑکوں کو اسکول چھوڑ کر آئے ۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا'' مسٹر عبدالباقی ' شاید یہ ٹھیک نہ ہوا ہو' آپ کو سڑک پر پٹائی نہیں کرنی چاہئے تھی ۔''

'' لڑکے یونیفارم میں تھے ۔ بستے کاندھوں پر تھے ۔ اسکول میں تیسرا پیریڈ ختم ہونے کو آرہا ہوگا اور میں ان لڑکوں کا کلاس ٹیچر ہوں ۔'' انہوں نے نہایت رکھائی سے جواب دیا۔

'' آپ کو معلوم ہے یہ افسران کے لڑکے ہیں ۔''

''آنے دیجئے افسران کو۔ فی الحال تو ان کی نا خلف اولادوں کو ہی رپورٹ لکھ کر دوں گا کہ والدین سے دستخط کرا کے لائیں۔''

اس واقعہ کے کوئی دو ماہ بعد ڈی ایس پی صاحب گاڑی روک کر چورسیا کی دکان سے بنارسی پان بندھوا رہے تھے کہ چھڑی ہاتھ میں لئے عبدالباقی سر دکھائی پڑ گئے۔ زور سے پکارا ''جناب والا!'' ڈی ایس پی صاحب جز بز ہو گئے اب یہ دوکوڑی کا ماسٹر یہاں بیچ چوراہے پر کیا کہنے والا ہے۔ میٹھے پان کا پتہ منہ میں کڑوا ہوا تھا۔

''آداب عرض جناب''

''آداب عرض عبدالباقی سر! سب کشل منگل ہے نہ؟''

''ماشاءاللہ' صاحبزادے تو ایک بار میں ہی سدھر گئے۔ ماہانہ امتحانوں میں اچھے نمبر لائے ہیں اور باقاعدگی سے اسکول آ رہے ہیں۔ کپتان بنیں گے انشاء اللہ بشرطیکہ آگے بھی سدھرے رہیں۔''

ڈی ایس پی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ ''لیجئے پان کھائیے۔'' انہوں نے ورق میں لپٹی خوشبودار گلوری بڑھائی ''نہیں جناب' شکریہ' میں اپنے طلباء کے والدین سے ایک پان تک قبول نہیں کرتا۔ پھر کبھی۔ جب صاحبزادے اسکول سے نکل جائیں گے تب کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

ڈی ایس پی صاحب روپے میں چار اٹھنیاں بناتے تھے۔ ذرا کی ذرا کو سر نیچے جھک گیا۔ بغل میں چھڑی دبائے باقی سر آگے بڑھ گئے۔ چوک گھنٹہ گھر کے پاس کھڑے گورنمنٹ بوائز ہائر سکنڈری اسکول کے ایک لڑکے نے پھسپھسا کر اپنے ساتھی سے کہا ''ابے' باقی سر!''

''تو کیا اسکول کا ٹائم ہے؟'' دوسرا تھوڑا اجھلایا۔ پھر سر کھجا کر بولا ''مگر ہاں پوچھ ضرور بیٹھیں گے' بیٹا' امتحان قریب ہیں۔ یہاں کیا جھک مار رہے ہو۔ جاؤ' جاؤ پڑھو جا کر''۔ دونوں چپکے سے سٹک لئے۔

لڑکے تو لڑکے اکثر تو لڑکوں کے والدین بھی باقی سر کو دیکھ کر چپکے سے سٹک لیتے تھے۔ ایک بار دانش علی رضوی نے اپنی نوجوان بیٹی سیما کو ہنس کر بتایا تھا۔

''کیوں پاپا' والدین کیوں؟''

''یہ عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جن کے لڑکے پڑھنے میں جی نہ لگاتے ہوں یا کسی بے ضابطگی میں پکڑے گئے ہوں۔ باقی سر راستے میں ان کے والدین کا بھی کلاس لے لیا کرتے تھے۔ ہاں مگر ابا سے بہت اچھی طرح ملتے تھے۔''انہوں نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔

''کیوں پاپا؟''

''ارے ہم اچھے اسٹوڈنٹ جو تھے'' ان کے لہجے میں فخر تھا۔ بس ایک بار مرغا بنایا تھا انہوں نے۔''

کیوں پاپا؟''

وہ اس کیوں کا صحیح جواب ٹال گئے'' باقی سر کے شاگردوں میں ایک بھی ایسا لڑکا نہیں تھا جسے انہوں نے مرغا نہ بنایا ہو یا جس کی ہتھیلیاں ان کی چھڑی سے لال نہ ہوئی ہوں۔ مگر ہم پر ان کو فخر بھی تھا۔ ہم میتھس میں ڈسٹنکشن لانے والے پانچ سات طلباء میں ایک تھے۔ پھر وہ جلدی سے بولے'' ایک بات ماننی پڑے گی۔ ان کے شاگردوں میں کوئی پھسڈی کبھی نہیں رہا۔ سب کسی نہ کسی فیلڈ میں اچھے ہی رہے۔''

دانش علی کے اندر ایک بے کلی دھویں کی طرح اٹھی۔

کیا باقی سر نے ریاضی کے ساتھ کچھ اقدار نہیں سونپی تھیں؟ اور کیا ابا نے کہیں کچھ اچھا نہیں چھوڑا تھا وراثت میں؟ ایک مرتبہ ابا کو معلوم ہوا تھا کہ جونیئر ہائی اسکول کے امتحان کی انگریزی کی کاپیاں رام آشرے بابو کے پاس آئی ہیں۔ عموماً جونیئر ہائی اسکول کے پرچوں کے لئے مقامی ٹیچروں کی خدمات بھی لے لی جاتی تھیں اب اللہ جانے رام آشرے بابو ممتحن تھے بھی یا نہیں لیکن پوری گرمی کی پوری چھٹیوں بھر ابا نے ان کے محلے کا رخ نہیں کیا جبکہ انگریزی واحد مضمون تھا جس میں دانش علی کی کور ذرا دبتی تھی۔ جب انہیں گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر کی ملازمت ملی تھی تو پہلی بات جو ابا نے کہی وہ یہ تھی'' بیٹا' یوں تو ہر شخص اپنی جگہ اہم ہے لیکن استاد ڈاکٹر اور قاضی، پورا معاشرہ ان کی خدمات پر ٹکا ہوا ہے۔ اپنے فرض میں کوتاہی اور بددیانتی کبھی نہ کرنا۔''

کیا پروفیسر دانش علی آج ابا اور باقی سر کے لئے فخر کا سبب بن سکتے تھے؟

ڈگری کالج میں، جہاں وہ فزکس کے پروفیسر تھے، بمشکل ہفتے میں دو کلاس لیا کرتے تھے۔ دنیا اچانک بدل گئی تھی۔ تاریخ، جغرافیہ اور ادب جیسے مضامین لینے والے عنقا ہوتے جا رہے تھے۔ اصل درسگاہیں اب کوچنگ انسٹی ٹیوٹ تھیں جہاں انٹرمیڈیٹ یا پلس ٹو کے بعد پڑھنے آنے والے طلباء کی بھیڑ رہا کرتی تھی۔ انجینئر، ڈاکٹر، ایم بی اے، سی اے وغیرہ کے لئے داخلے کے امتحان دینے والے بچوں پر ان کے والدین بے تحاشہ پیسہ خرچ کر رہے تھے۔ دانش علی کالج کے کلاس نظر انداز کر کے بیک وقت تین ایسے کوچنگ سینٹروں میں کام کر رہے تھے۔ کالج کی تنخواہ کہیں نہیں گئی تھی۔ پھر کتنی مرتبہ انہوں نے دوست احباب، رشتے داروں ''بڑے آدمیوں'' کی سفارش پر نااہل طلباء کے نمبر بڑھائے تھے اس کی انہیں گنتی بھی شاید یاد نہ ہو۔ جب بھی ضمیر کچوٹتا تو ایک خیال اس پر فوراً ٹھنڈے ٹھنڈے پھاہے رکھ دیتا' اس خرابی میں وہ اکیلے نہیں تھے۔' ناانصافیوں میں ملوث ہونے کے لئے یہ وجہ کافی ہے کیا؟' اگر ضمیر یہ سوال کرتا تو وہ اس پر وزنی پتھر رکھ دیتے۔ ویسے عرصہ ہوا کہ ضمیر نے سوال کرنے بھی بند کر دیئے تھے۔ سارا کچھ نارمل کے زمرے میں آ چکا تھا۔ کہیں کچھ غلط تھا ہی نہیں اگر تھا تو وہ جس سے دانش علی کا اپنا مفاد مجروح ہوتا ہو۔

انہوں نے کپڑے تبدیل کر کے جوتے کے فیتے باندھے اور باہر نکل آئے۔ گاڑی سروسنگ کے لئے گئی ہوئی تھی شہر بہت بڑے شہروں میں نہیں تھا۔ اکثر فاصلے رکشہ سے طے ہو جاتے اور کبھی کبھی رکشے میں ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے شام کو نکلنا انتہائی فرحت بخش ہوا کرتا تھا۔ ہوا واقعی اس دن نہایت فرحت بخش تھی لیکن باہر آنے پر انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے دل مٹھی میں لے لیا ہو۔

برگد کے گرد ان کے بچپن میں بنایا گیا چبوترہ کب کا ٹوٹ چکا تھا اور برگد کاٹا بھی جا چکا تھا۔ آج املی پر کلہاڑیاں چل رہی تھیں۔ گھنے باریک، سبز پتوں والے املی کے پرانے سایہ دار درخت کے موٹے موٹے گدّے زمین پر آ رہے تھے جیسے تنومند پہلوانوں کو کسی نے پچھاڑ کر دھول چٹا دی ہو۔ پڑوس کے لالاؤں کی بٹیا کل سویرے ہی اپنا جھولا کھول کر لیجا چکی تھی۔

جواہر میدان کے باقی بچے حصے میں بھی ایک کثیر منزلہ عمارت کی تیاریاں زور شور سے چل رہی تھیں ۔ پچاس' باون برس پر محیط اس طویل عرصے کے دوران رائے بہادر کے پوتوں نواسوں نے میدان کی ایک ایک انچ زمین کا بٹوارہ کر کے اسے عمارت ساز کمپنیوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کتنا کچھ بدلا تھا۔ شہر میں دو ڈگری کالج کھلے تھے اور پانچ کوچنگ سینٹر' واحد اردو میڈیم اسکول طلباء کی کمی اور انتظامیہ کے جھگڑوں کے سبب بند ہو چکا تھا۔ نام نہاد انگریزی میڈیم پبلک اسکول کُکرمتوں کی طرح روز سر نکال رہے تھے۔ شہر کے آخری سرے پر واقع ریڈ لائٹ ایریا کچھ زیادہ آباد ہو گیا تھا۔

دانش علی رضوی کو اس وقت اسی طرف سے گذرنا تھا۔

طبلے کی ٹھن ٹھن اور گھنگھروؤں کی جھنکار دلوں میں خوشی نہیں بلکہ ایک ڈراونی سی اداسی اور دلگرفتگی کا سبب بنتی تھی جیسے فضا میں جادوگرنیاں رقصاں ہوں یا بس ابھی جن بھوت اڑتے ہوئے گذرے ہوں ۔ دانش علی جیسوں کو ادھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا تو نظریں جھکائے تیزی سے گذر جاتے ۔ کبھی کبھار کوئی آدمی دبکتا ہوا شام کے دھندلکے میں مدغم ہونے کی کوشش کرتا جھپ سے کسی زینے پر چڑھ جاتا۔ اندھیرا بڑھتا تو گلی پوری طرح جاگ جاتی ۔

''تیز چلو ذرا'' دانش علی نے دانت پیس کر رکشے والے کو مخاطب کیا۔ اس کی نظریں بار بار اوپر اٹھ جاتی تھیں اور یقیناً علاقے میں داخل ہونے کے بعد رفتار میں آنے والی سستی دانستہ تھی ۔

ایک کھڑکی سے وہ نئی آئی ہوئی لڑکی جھانک رہی تھی جس کا تذکرہ اڑتا اڑتا شہر کے بیشتر گھروں تک پہنچ چکا تھا۔ شاجہاں ۔

''جانو' اُو جھانکت ہے' ساجہاں'' رکشے والے کے لہجے سے رال ٹپک رہی تھی ۔

ایک اضطراری حرکت کے تحت دانش علی کی نظریں ادھر اٹھ گئیں (روزی روٹی کے لئے وہ جو کچھ کریں عورت کے معاملے میں نہایت شریف انسان تھے اس لئے وہ ایک اضطراری حرکت ہی تھی)

وہ ایک خوبصورت چہرہ تھا وہاں نظر آنے والے بیشتر چہروں کی طرح پھوہڑ پن سے لپا پتا

نہیں بلکہ نہایت سلیقے کے میک اپ سے مزین۔ نیچے کھڑے دو طرح دار نو جوان جو ادھر ادھر دیکھ کر جھپ سے اوپر چڑھنے کی تاک میں تھے' دانش علی کے کالج میں' بلکہ خود ان کے شعبے میں پڑھنے والے طلباء تھے۔ وہ ڈے اسکالر تھے اس لئے جانے پہچانے گھروں کے تھے۔ اچھے گھروں کے چشم و چراغ۔

آنکھیں بھرپور چار ہوئیں لیکن جس نے گھبرا کر نظریں جھکائیں وہ دانش علی ماس ساب تھے' لڑکے نہیں۔ کہیں دل کے اندر ایک طنزیہ صدا ابھری، ''ایڈز کے اس دور میں کنڈوم رکھ لئے ہیں میاں؟'' لیکن کچھ بھی کہنے کی بجائے انہوں نے وہاں سے سٹک لینے میں عافیت سمجھی۔ وہ رکشے والے پر غرائے۔

''تجھے کیا لینا ہے شاہجہاں' جہانگیر سے؟ تیز چل اور نکل جلدی یہاں سے۔''

لڑکوں کے مشترکہ قہقہے نے ان کا پیچھا دور تک کیا۔

☆☆

"امّاں آم دو۔ امّاں آم دو۔" پنجرے میں مٹھو گھوم گھوم کے چلّایا۔
آموں کا موسم تو کب کا جا چکا۔ ہمیشہ کی طرح۔ دودھیا مالدہ، لال منہ والا گلاب خاص، سنہرا دسہری۔ سب بازار سے اٹھ گئے۔ برسات شباب پر آئی ہمیشہ کی طرح۔ پھر جاڑے کی آمد ہو گئی۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح۔ کتنے موسم آئے، کتنے موسم گئے۔ اب کیا گنتی کرنے کا کچھ فائدہ ہے۔ دن ٹپ ٹپ کر کے گرے۔ مولوی چچا کے باغ میں پکے آموں کی طرح۔ زمین پر بچھ بچھ گئے۔ ٹوٹی مالا کے منکوں کی طرح مٹی میں رُل گئے۔ اتنے سارے دن۔
جمعہ آتا تھا، جمعہ جاتا تھا۔ اماں بھیا کے لیے کلف لگا، چکن کا لکھنوی کرتا اور علی گڑھی پاجامہ نکال کر بستر پر رکھتیں۔ بھیا کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتا۔ آج پھر مصیبت ہے۔ اماں ہتھے سے اکھڑ جاتیں۔ کم بخت، صرف ایک دن تو مسجد جا کر نماز پڑھتا ہے اور اسے بھی مصیبت گردانتا ہے۔
جمعہ ہفتے میں کے بار آجاتا ہے اماں؟ بھیا انتہائی معصومیت سے سوال کرتا۔ اب کی اماں اس قدر ناراض ہو جاتیں کہ ان کی بولی نہ نکلتی۔ بس گھور کے دیکھتیں اور منہ پھیر لیتیں اور تب تنویر فاطمہ عرف تنو سوچا کرتی تھی کہ جمعہ جلدی کیسے آسکتا ہے۔ وہ تو اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار، اور اپنے وقت پر ہی آتا رہے گا۔ مگر تنو اب ایسا نہیں سوچتی ہے۔ وہ تو سوچنے

لگی ہے کہ جمعہ ہی نہیں ہفتے کے سارے دن بہت جلدی آجاتے ہیں۔ لو ابھی تو آیا تھا اتوار۔ ابھی پھر آگیا۔ دن ہیں کہ ساون کی جھڑی کہ برسے جا رہے ہیں۔ برس برس کے بہے جا رہے ہیں اور بہائے جا رہے ہیں نہ جانے کتنا کچھ۔

''کھلک چبنیا کال کا، کچھ مکھ میں کچھ گود۔''

یہ تمہارے کبیر داس خاصے قنوطی واقع ہوئے تھے۔ جمیل بھائی کھلک کو بڑی زور سے ڈپٹنے والے انداز میں ادا کرتے اور تنو اور از یں قبیل دوسرے افرادان سے خوب ہی تو چڑتے۔ نیاز احمد عرف جمیل ان میں سب سے بڑے تھے۔ سائنس کے طالب علم تھے لیکن زیادہ تر اردو، ہندی کی ادبی کتابیں اٹھا اٹھا کے پڑھتے رہتے۔ ایک دن بایولاجی کے پریکٹیکل میں گلہری کاٹنے کو ملی تو کلاس چھوڑ کے بھاگ آئے۔ پھر ہفتہ بھر نہیں گئے۔

''یہ حضرت فاطمہ کی گڑیا ہے''اماں گلہری کے بارے میں کہا کرتی تھیں۔''انہوں نے اس پر پیار سے ہاتھ پھیرا تھا اس لیے اس کی پیٹھ پر نشان بن گئے۔''

''اماں۔ ہندوؤں کے یہاں مشہور ہے کہ گلہری کی پیٹھ پر سیتا جی نے ہاتھ پھیرا تھا۔'' بھیا اور بولے بغیر مان جائے۔

''ارے تو دونوں نے پھیرا ہوگا۔''اچھن جھٹ سے سمجھوتہ کر لیتے۔ ویسے بھی اچھن کو بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مثلاً یہ کہ آم اگر کترا ہوا ہے تو وہ طوطے نے کترا ہے یا کوئل نے۔ ایک بار جمیل بھائی نے بڑے سے قلمی آم میں منہ مارا اور اچھن کے سامنے پیش کر کے پوچھا۔

''اچھن بتاؤ یہ آم کس نے کترا ہے۔ طوطے نے یا کوئل نے؟''

اچھن نے آم کا بغور معائنہ کیا۔ سُوں سُوں کر کے سونگھا۔ کچھ دیر کچھ سوچتے رہے پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔''ضرور کسی بیل نے کترا ہے۔''اچھن اس دن سے گرو قرار پائے۔

اچھن گرو مان تو لیے گئے لیکن لوگوں نے انہیں چڑانا نہیں چھوڑا۔

اچھن کے دو لچھن، بلّیا کے دو کان

اچھن گئے باجار ٹیک دُس شیطان

کئی اور باتوں کی طرح اچھن کو چڑانے کی ابتدا کا بھی لپا گو کے گاؤں جانے سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ وہ کوئی برس ڈیڑھ برس بعد گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو اچھن کو چڑانے کے لیے

ایک ،کبت لے کر آیا۔نہایت فصیح و بلیغ اور ذلت آمیز۔دراصل جو اور یجنل کبت تھا اس میں اچھن بازار نہیں بلکہ کھیت میں فراغت حاصل کرنے گئے تھے۔اماں اور دادی کے ڈر سے لوگوں نے اسے تبدیل کر دیا تھا لیکن اکیلے دوکیلے جب کوئی بڑا پاس نہ ہوتا تو یہ اپنی اصلی شکل میں دہرایا جاتا تھا۔اچھن جائیں تو جائیں کہاں۔چڑائے کوئی لیکن پٹتا عموماً لپا گو ہی تھا۔ایک تو یہ کہ سارے فساد کی جڑ وہی تھا۔اوپر سے کمزور بھی کہ گھر کا ملازم تھا۔(پٹ جائے تو کوئی پرسان حال نہ ملے)۔اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ مسجع کلام اس نے اصل صورت میں لوگوں کو سکھایا تھا۔یوں دیکھا جائے تو بازار میں بھی شیطان کے ذریعے پٹخ دیے جانے کی بات کچھ کم اہانت انگیز نہ تھی۔

انہیں اچھن کا ای۔میل آیا تھا امریکہ سے۔ہوائی جہازوں میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ذیابیطس کے مریض پہلے ہی تھے،اب دل کا عارضہ بھی ہو گیا۔لڑکی نے ایک نیگرو سے شادی کر لی ہے۔کم بخت کو غیر مذہب،غیر ملک،غیر ذات میں ہی شادی کرنی تھی تو کم از کم کسی گوری چمڑی والے سے تو کرتی۔

''اب بیٹے کی شادی جلدی کر ڈالو۔اس سے قبل کہ وہ بھی کوئی کالی پیلی نکٹی لے آئے۔'' تنویر فاطمہ عرف تنو نے ہول کے عزیز احمد عرف اچھن کو جوابی ای۔میل کیا۔

اس بار اچھن میاں کا فون آیا (کہ ای میل میں کوئی دہاڑیں مار کے رو نہیں سکتا)۔انہوں نے بات بعد میں کی پہلے دہاڑیں مار کے روئے۔''آپا،ہم ہجرتوں کے نوحہ خواں،کون کون سی خبریں دے کر آپ کے دکھوں میں اضافہ کریں۔بیٹا تو نہ جانے کب سے ایک لڑکی کے ساتھ یوں ہی رہ رہا ہے۔لاکھ کہتا ہوں،اچھا چلو یہی سہی۔شادی تو کر لو۔جواب دیتا ہے:''بہت شادیاں کر چکے آپ لوگ۔اب اس دقیانوسی انسٹی ٹیوشن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔'' تنو سناٹے میں آ گئی۔گناہ ثواب،اچھے برے کے معیار بھی کتنے بدلتے جا رہے ہیں۔کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔پھر اس نے خود کو سنبھالا۔''آسیہ کے لیے رنج کرنا چھوڑ دو اچھن۔آخر اس نے شادی کی ہے نہ۔بیٹی ذات۔اگر وہ بھی شادی کے انسٹی ٹیوشن کی قائل نہ ہوتی تو۔اور بھیا اچھن،انسان تو سب انسان ہی ہیں۔'' پھر اس خوف سے کہ کہیں اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن اسے خود دہاڑیں مار کر رونے پر مجبور نہ کر دے اس نے یک لخت فون بند کر دیا۔

یہ چپ تنویر پر کئی دن اتری رہی۔ خود اس کا بڑا بیٹا زیادہ سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں اپنے بال بچوں کو لے کر اڑ چکا تھا۔ لاکھوں میں کھیل رہا تھا لیکن اس کے باپ مکان بنوانے میں مقروض ہو گئے تھے۔ اس نے کبھی چار پیسوں کو نہ پوچھا۔ تنو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی تھی کہ چلو وہ تو خوش ہے۔ لیکن بیٹی جو ایم ایس ڈبلیو کر کے بمبئی جیسے جنگل میں نوکری کر رہی تھی ''گھر کی آدھی اور باہر کی ساری'' جیسا محاورہ اس کی سمجھ سے کوسوں دور تھا۔ جو بھی رشتہ آتا اس میں عیب نکال کر اسے رد کر دیتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کا انسٹی ٹیوشن اس کی بھی سمجھ سے پرے ہو جائے۔ تنو کا دل بیٹھنے سا لگتا۔

اس سے چھوٹا سلمان ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی امتحان میں بیٹھتا تھا یا انٹرویو دیتا تھا۔ ہزاروں روپے فارم بھرنے، فیس دینے اور سفر کے اخراجات پر خرچ ہوتے رہے تھے۔ نتیجہ ابھی تک ڈھاک کے تین پات تھا۔ معمولی نوکری ملنے کا امکان تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چھوٹے موٹے بزنس کا تو خیال ہی اہانت انگیز تھا۔ وہ اپنی ساری ناکامیوں کا ذمہ دار والدین کو ٹھہراتا تھا۔ ''ابا اگر مکان نہ بناتے، وہی روپیہ خرچ کر کے کہیں مجھے ملازمت دلا دیتے تو آج میری حالت یہ نہ ہوتی۔'' اس نے کئی بار کہا تھا۔ ابا کچھ دن ہوئے کہ تمام الزامات سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ جب تک جئے اپنی ساری نامرادیوں اور بچوں کی نافرمانیوں کا ذمہ دار تنو کو ٹھہراتے رہے۔ تنویر پر کوئی ردعمل نہ ہوتا۔ وہ پتھر بنی سنتی رہتی تو وہ اپنا سب سے نوکیلا حربہ آزماتے جو سیدھا دل میں اتر کر ایک چھید بناتا...... ''اور یہ لڑکی...... رابعہ۔ یہ بے شرم۔ اس نے تو حد ہی کر رکھی ہے۔ یہاں اسکول میں پڑھانے کی نوکری مل رہی تھی وہ نہیں کی، چل دی بمبئی۔ اکیلی رہتی ہے اور منہ کھول کر اپنی شادی کی باتیں کرتی ہے۔ ننہال پر گئی ہے ننہال پر۔''

فقیر ایسے وقت میں آتا کہ گھر میں لڑکے بالے یا لپا گو، کوئی نہ ہوتا تو دادی یا اماں بند دروازے تک آتیں۔ پیالے میں آٹا رکھ کر کنڈی کھڑکاتیں اور جھپ سے واپس ہو جاتیں کہ فقیر ہاتھ بڑھا کر اندر سے آٹا لے لے۔ وہ جھولی میں آٹا ڈال کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا اور واپس کنڈی کھڑکا کے چلا جاتا۔ محلے کے فقیر اس معمول کے عادی تھے۔ ان کے اور گھر کی بزرگ خواتین کے درمیان کنڈی کا یہ رابطہ ہمیشہ چلتا رہا۔ ان کا آنچل کبھی کسی نے نہیں دیکھا، نہ ان کی آواز سنی۔ اماں اور دادی کے درمیان کوئی ''جنریشن گیپ'' نہیں تھا۔ دادی کو حضرت

رابعہ بصریؒ سے سخت عقیدت تھی۔اماں نے ان کی عقیدت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پہلی نواسی کا نام رابعہ رکھا تھا جو نواسی کو سخت ناپسند تھا۔ان نیک بیبیوں کو دنیا کی خبر کبھی نہ ہوئی۔

چند سال پہلے تنو گھر آئی تھی۔بہری بھنڈ دادی اب اپنے کھٹولے پر پڑی رہتی تھیں۔اماں کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے لیکن بینائی برائے نام رہ گئی تھی۔مولوی چچا کا آموں کا باغ کٹ گیا تھا۔وہاں چمڑا بنانے کا کارخانہ لگ گیا تھا۔گرمیوں میں امرائیاں بَور اتیں تو بھینی بھینی خوشبو ہر طرف چکراتی پھرتی۔اب چمڑا مہکتا تھا۔کئی فرلانگ دور سے اس کی بو محسوس کی جا سکتی تھی۔

دادی بڑی نفاست پسند تھیں۔دادا کے انتقال کے بعد بھی سفید کپڑوں پر ہلکا سا عطر ضرور لگاتیں۔اماں کانوں میں بیلے کی کلیاں چاندی کی بالیوں میں پرو کر پہنتیں۔اچھا ہے دادی کے سارے حواس جاتے رہے۔خوشبو بدبو کا بھی کوئی احساس نہیں۔زندگی الٹے گوپال، آموں اور اچھن پر بنائے گئے کبت کی جگہ بالکل چڑیل صورت ہوگئی ہے،......،دانت نکوسے،دل ہر وقت ڈوبتا سا رہتا۔کسی روبوٹ کی طرح اکیلی تنو سارے گھر میں گھومتی پھرتی تھی۔

اماں اور دادی سے یہ تنو کی آخری ملاقات تھی۔دونوں آگے پیچھے اپنی اپنی نیکیوں کا اجر سمیٹنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔اماں اگر دادی کی عمر پاتیں تو ابھی اور بہت دن جی سکتی تھیں۔

جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو اسٹیشن پر اندھیرا تھا۔بجلی چلی گئی تھی اور آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔وہ بھی برسات کا ہی موسم تھا۔سلمان کو اس کے باپ نے دھکا دے کے بھیجا تھا کہ جا کے تنو کو لے آئے۔وہ نہایت خراب موڈ میں تھا۔جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے جوتے کی نوک سے خیالی کنکروں کو ٹھوکریں لگا رہا تھا۔بارش کے اندیشے سے تنو ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے آ گئی۔یکا یک ٹپ سے وہ کچھ گرا جو پانی نہیں تھا۔پھر کچھ دیر بعد پٹ سے کچھ اور۔ٹپا ٹپ جاری رہی۔تنو ذرا سا ہلی تو چپل کے نیچے کچ سے کچھ آیا۔

کاہے کا درخت ہے سلمان۔اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چل رہا۔

''اور جیسے میں تو روشنی میں کھڑا ہوں۔''وہ دھیرے سے بُدبُدایا پھر بولا''مولسری کا درخت ہے، پھل گر رہے ہوں گے۔''

''پھل یا پھول......؟''''پتا نہیں۔''اس نے بیزاری سے جواب دیا۔پھر مزید بھنبھنایا۔''بال کی کھال نکالنے لگتی ہیں۔''

''اب سب ایک دوسرے سے بیزار کیوں رہا کرتے ہیں؟'' تنو نے اداسی سے سوچا۔ پھر اسے یاد آیا ایسے تو مہوے کے درخت کے نیچے مہوہ ٹپکا کرتا تھا۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ سنہرے رس بھرے انگوروں جیسے پھول۔ تنو انہیں پھل سمجھتی تھی۔ ناگوار حد تک تیز میٹھی خوشبو والے، سوکھیں تو جیسے کشمش۔ لپا گو نے بتایا تھا اس کی دادی خشک مہوے اور گیہوں کے موٹے پسے آٹے سے بڑی مزیدار لپسی پکاتی تھیں۔ مولسری نے ایک اور پھل ٹپکایا۔ ٹپ۔

ٹیپ سے ٹپاک سے کپار کا ہے پھوڑے رے

ہینگرا ایسا ڈینگرا ایسارات کا ہے ڈولے رے

''تنو منّی۔ بوجھئے تو جانیں۔'' لپا گو نے پہیلی بجھائی۔

''جانے کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے۔'' اچھن نے منہ چڑایا۔

''بکواس نہیں اچھن بھیا۔ بوجھئے نا۔ بجھوّل ہے۔''

''ارے یہ کیسی بجھول۔ تیری الٹی کھوپڑی جیسی۔''

''اچھا کہئے ہاری۔''

تنو کی انا پر تجسس حاوی ہو گیا۔ ایک بار میں ہی ہاری بول دی۔

''دیکھئے تنو منی ایک تھا مہوے کا پیڑ۔'' اچھن نے گردن ٹیڑھی کی۔ لپا گو نے ٹیڑھی گردن کو یکسر نظر انداز کر دیا اور یوں گویا ہوا۔ ''ایک تھا مہوے کا پیڑ۔ اس کے نیچے رات کو ایک سانپ آن کے بیٹھ گیا۔ پھن کاڑھے کالا سانپ...... شوں۔ اوں......'' لپا گو نے آواز نکالی اور ہاتھ سے سانپ کا پھن بنایا۔ ''مہوے کا پیڑ بھلا کاہے کو ڈرے۔ اس نے تاک تاک کے سانپ کے پھن پہ اپنے سنہرے رسیلے پھول ٹپکائے۔ ٹپاٹپ، ٹپاٹپ۔ سانپ جھونجھل کھا کے بولا۔

''ٹیپ سے ٹپاک سے کپار کا ہے پھوڑے رے''؟

پیڑ کاہے کو چوکتا۔ تڑ سے جواب دیا۔ ''ہینگرا ایسا ڈینگرا ایسا رات کا ہے ڈولے رے۔''

لپا گو نے ہاتھ سانپ کی طرح بنا کے پھر لہرایا۔ ''بغیر ہڈی والا جیو، سَل سَل کرتا سانپ، ارے تو اتنی رات کو ڈولتا ڈالتا بھلا میرے نیچے آیا ہی کیوں۔ اب تیرا سر پھوڑوں کہ نہ پھوڑوں۔ اب کیا ہے اچھن بھیا کہ سانپ کو ایسا دوٹوک جواب کسی نے کاہے کو دیا ہوگا۔ وہ کھسیا کے وہاں سے بھاگ گیا۔''

سانپ کے کھسیانے کی بات نے سب کو خوب ہی تو محظوظ کیا۔ لپا گو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ایک تو اس کی پہیلی کوئی بوجھ نہ پایا اس پر سے پہیلی میں پوشیدہ کہانی سب کو خوب ہی تو بھائی۔ وہ کہانی دوہرا دوہرا کے گھر کی بزرگ خواتین کو خوب ہی تو عاجز کیا کرتا۔ لاکھ دادی چلاتیں اور اماں نصیحت کرتیں کہ رات میں نام مت لیا کرو۔ ماموں کہو یا رسّی لیکن کوئی کاہے کو سنتا۔ سب ایک دوسرے کے سر پر ٹیپ مارتے اور کہتے "ہینگر ایسا ڈینگر ایسا رات کا ہے ڈولے رہے۔"

کچھ عرصے بعد جمیل بھائی اپنے لانبے قد اور دبلے پتلے جسم کی وجہ سے مستقل طور پر ہینگر ڈینگر کہلانے لگے۔

ہینگر ڈینگر جمیل دلّی کے کسی آرکیٹیکٹ سے ایک دوست کے مکان کا نقشہ بنوانے کو جاتے ہوئے کار کے حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ بس مہینہ بھر پہلے بڑی اچھی ملازمت ملی تھی۔

کبیرا گرب نہ کیجئے، کال گہے کر کیس
کیا جانیے کِت مارِیے کیا گھر کیا پردیس

ارے میاں کبیر کبھی تو کوئی دل خوش کن بات کر لیتے۔ اب دیکھو نا ایسا لگتا ہے جیسے ایک مہیب صورت، سیاہ فام، دیو قامت انسان لوگوں کے بال پکڑے گھسیٹتا لیے چلا جا رہا ہے۔ لوگ گھس گھسا کے چنوں جیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ انہیں ایک بڑے سے ٹوٹے پھوٹے بدرنگ پیالے میں ڈالتا ہے۔ پھر مٹھی بھر بھر کے منہ میں۔ کڑ کڑ کڑاک! کھلک چبنیا کال کا تنو رونکھی ہو گئی تھی۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھیں۔ تب جمیل بھائی نے نظیر اکبر آبادی کی نظم ریچھ کا بچہ سنا کر اسے ہنسایا تھا۔ وہ منہ سے بڑی عمدہ ڈگڈگی بجایا کرتے تھے۔ ان کی ڈگڈگی کی تال پر لپا گو ریچھ کا بچہ بن کرنا چا تھا اور تنو کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔ ہنسی اب اتنی جلدی کیوں نہیں آتی۔ رونے اور ہنسنے کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ کیوں گئے ہیں؟ قہقہے کہاں گم ہو گئے؟

بھاری دل کے ساتھ تنو نے بیلے کا گملا سرکایا۔ پودا کلیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تنو نے ایک رسالے میں ایک پنجابی گیت کا ترجمہ پڑھا تھا جس میں محبوب کے دانتوں کو بیلے کی کلیوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اپنی قابلیت بگھارنے کے لیے اس نے اسے اپنی 'لوک سبھا'

میں دوہرایااور مطلب بیان کیے۔لپا گو نے اس حسین تشبیہ کا تیاپانچہ کر کے رکھ دیا۔دانت نپور کر بولے ''اب اگر بتیسی کی جگہ بیلے کی کلیاں ہوں اور جو کہیں گنا مل جائے چھیل کے کھائے کو یا ہڈی چباوے کو پڑے وہ بھی تنومنی کی طرح...... ایسے چباتی ہیں کہ کتے کے کھانے کے لائق نہ رہ جائے تو بھیا دانت تو کچ کچ کر کے باہر۔ ہیں ہیں ہیں...... باہر بھی نہیں۔سیدھے پیٹ کے اندر اور منہ ایسا جیسے ابھی پیدا ہوئے ہوں۔''

کم بخت اوندھی کھوپڑی...... جو بات کرے گا سوالٹی۔ مارے غصے کے تنو رونکھی ہوگئی......

گرچہ اراکین کو اس تشبیہ کی درگت جو دراصل تنو کی درگت تھی، بہت پسند آئی تھی لیکن وہ اس بات سے بھی خاصے خوش ہوئے کہ گوپال کی کھوپڑی اوندھی ہے۔اس لیے اراکین نے گوپال کو جو اس وقت تک لپا گو کے درجے پہ فائز نہیں ہوئے تھے الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔اچھن تو بھاگ کے سلیٹ اور چاک بھی اٹھالائے اور نفیس احمد عرف بھیا کا فیصلہ آخری مانا گیا۔اس طرح گوپال بن گئے لپا گو اور تنو ان سب میں سب سے زیادہ ہنسی۔ بقول دادی ڈھینگ کی ڈھینگ اور بقول بھیا لمڈھگ اور بقول جمیل بھائی ٹڈا...... بانس بانس بھرا چھلتی تنو یقیناً یہ سب لگی ہو گی بلکہ ان سب کا امتزاج۔

''کیا واقعی میں کبھی اس طرح ہنس سکتی تھی؟ دل کے اندر کی گہرائیوں سے؟ وہ بھی ایسی فضول باتوں پر؟'' تنو نے گملے کو پرلی طرف رکھا اور مرچوں بھرا سوپ اٹھایا۔آج دن بھر دھوپ نکلی تھی۔ برسات کی صاف ستھری چٹک دھوپ۔ جی چاہے مرتبان میں بھر کے رکھ لو کہ جھڑی لگنے کے وقت کام آئے۔ساری مرچیں سیلی جارہی تھیں۔وہ سچ مچ ہنس پڑی۔پھر شرمندہ ہو اٹھی۔کہیں کوئی اسے یوں اکیلے میں ہنستے تو نہیں دیکھ رہا۔کہیں کوئی مرتبان میں دھوپ بھرنے کا احمقانہ خیال تو نہیں پڑھ لے رہا۔کیا ہی اچھا ہے کہ سائنس نے ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا جس سے دوسروں کے خیالات پڑھے جاسکیں۔

وہاں کوئی نہیں تھا علاوہ اس بلی کے جو دیر سے منڈیر پر ساکت بیٹھی ایک چوہے پر گھات لگا رہی تھی۔ نیچائی سے تنو کو اس کے صرف دو کان نظر آرہے تھے۔نوکیلے زرد پتوں کی طرح۔ یک لخت وہ دھب سے کودی۔ایک موٹا چوہا جان بچا کے بھاگا۔مٹھو نے پھر چک پھیریاں لیں اور چلایا بل بل بل۔ ہش ہش۔

لپا گو نے بتایا تھا کہ اس کے پڑوس میں ایک مولی ساب رہا کرتے تھے۔ ایک دن مولویائن نماز پڑھ رہی تھیں کہ بلّی آ گئی۔ دودھ کی پتیلی منہ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ مولویائن زور سے بولیں الحمد اللہ ربل اور سورۂ فاتحہ کا باقی حصہ حسب دستور زیر لب پڑھا۔ بلی بھاگ نکلی۔ قصہ رہ گیا۔

ارے کم بخت لپا گو!۔ بچوں کو یہ کیا سکھا دیا ہے۔ بے ادبی کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں بلی دیکھی الحمد اللہ ربل کا ورد شروع۔ خیر سے آس پاس بلیاں تھیں بھی کئی عدد۔ یہ مٹ گیا اللہ مارا مٹھو۔ بی جی بھیجو سیکھنے میں اتنے دن لگا دیے اور یہ ربل ربل جھٹ سے از بر۔ جمیل بھائی نے دادی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ دادی یہ قصہ تو لپا گو سے پہلے اس سرفراز لطیفے باز نے سنایا تھا۔ لپا گو نے تو محض اس میں یہ پھندنا ٹانکا ہے کہ مولویائن اس کے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ پتا نہیں ہر بات میں مذہب کہاں سے درآتا ہے۔ کہہ گئے نا داس کبیر کہ ہندوا ندھا ترکو کانا۔ انہوں نے ایک آنکھ دبائی اور دیر تک کانے بنے رہے۔

جمیل بھائی کی خبر سن کے لپا گو کچھ دیر گم سم بت بنا بیٹھا رہا تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ برس بعد ادھر آیا تھا۔ ابا نے اسے زمانہ پہلے کسی کارپوریشن میں نوکری دلوادی تھی۔ اس کا بھٹہ بیٹھ گیا۔ ملازمین کو سالوں تنخواہ نہیں ملی تو لپا گو واپس گاؤں چلا گیا۔ تب سے وہ بس یوں ہی کبھی کبھار ہینگر ڈینگر سا آن نکلتا تھا اور اس بار تو خیر بہت دن لگا دیے تھے۔

''تنومنّی...... (وہ سب چالیسویں پر اکٹھے ہوئے تھے ہم ہر گھٹنا پر یہی سوچتے ہیں کہ اس سے بھی برا ہو سکتا تھا۔ تب ہمیں تسلی مل جاتی ہے۔ اب دیکھئے نا ہماری لگی لگائی نوکری چلی گئی۔ اگر ہاتھ پیر چلے جاتے تو ہماری لگائی کا کیا ہوتا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ کھیت مجوری کر کے سب کو پال لیا نہ۔ دونوں لڑکے نکل لیے۔ ایک کلکتے میں ہے ایک پٹنے میں۔ دو لڑکیاں تھیں۔ بیاہ کے اپنے اپنے گھر۔''

''دھیا جنوائی لے گئے، بہویں لے گئیں پوت
داس کبیرا یوں کہیں تورہا اُوت کا اُوت''

''یہ جمیل بھیا بولتے تھے......'' اس نے جلدی سے کہا۔

''گوپال...... جمیل بھائی کے ساتھ اس سے برا کیا ہو سکتا تھا؟'' تنو نے اندرامنڈتی برہمی کو پی کر کہا۔

''جمیل بھیا کا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اگر بیاہ ہو گیا ہوتا تو دلہن تو کم عمر رہتی نا ابھی ایک آدھ بال بچہ رہتا۔ کون اگورتا بتایئے تو؟'' لپا گو نے دنیا دیکھ کر جان لیا تھا کہ کسی کے گھر کوئی کسی کو اگورا نہیں کرتا۔ لپا گو نے آگے بھی بات جاری رکھی تھی...... ''اور تنو منی جو جمیل بھیا مرتے نہیں لیکن اپاہج ہو کر ایسے پڑ جاتے جیسے نسیم چچا کا بیٹا......''

تنو کانپ گئی تھی۔

''لڑکے بالے ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے اپنا دھیان بٹانے کو پوچھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہی ہوں گے۔'' اس کی آواز میں تاسف کی آہٹ تھی لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا تھا۔

''دو جون کی نمک روٹی کا پیسہ ہو جاتا ہے۔ لگائی کا دماغ چل گیا ہے۔ پہلے بھی ماتھا کمزور تھا۔ جو اناج کما کے لاتے ہیں خود ہی ٹھوکنا بھی پڑتا ہے مگر ہم سوچتے ہیں تنو منی کہ جیسی بھی ہے ساتھ تو ہے۔ نہیں تو جھونپڑی میں اُلو بولتا۔ جب کام نہیں ملتا تو اس کی سیوا کر کے وقت کاٹ لیتے ہیں۔''

تنو نے دیکھا گوپال کی قمیص کئی جگہ سے گونتھی ہوئی تھی۔ اس کے پیر میں چپل نہیں تھے۔ جب وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا اس کا حلیہ کہیں بہتر ہوا کرتا تھا۔ صحت بھی بہت اچھی تھی۔ اب وہ بالکل گھسا ہوا لگ رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی صورت چنے جیسی ہو جائے گی اور وہ اس پچکے ہوئے مہیب المونیم کے پیالے میں جا پڑے گا۔ تنو نے ہول کر سوچا کہ وہ بھی جمیل بھائی جیسی بن گئی ہے۔

''ہونی کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی تنو منی۔ اور سمے کو کوئی نہیں روک سکا۔ باقی رہا یہ سنسار، یہ اپنی چال چلتا رہتا ہے۔'' الٹی عقل والے گوپال نے مسرور لہجے میں کہا پھر وہ قہقہہ لگا کر کھلے دل کے ساتھ ہنسا۔ بھیا نے جھلا کے کہا ''ابے اب کیا ہوا؟''

''ہم سوچ رہے تھے بھیا کہ آپ جس تخت پر بیٹھے ہیں یہ اگر سونے کا ہو جائے تو......بس ہمیں ہنسی آ گئی۔''

''دماغ تیرا چل گیا ہے۔ تیری بیوی کا نہیں۔ بلا وجہ بے چاری کو بدنام کر رکھا ہے۔'' اس نے بھیا کی تشخیص کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

''دیکھئے تنو منی...... شاما آئی۔'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کے کہا۔

اماں منڈیر پر کاکن اور پانی رکھا کرتی تھیں۔ ان کے اس لنگر خانے میں بہت سی چڑیاں آیا کرتی تھیں لیکن تنو کو سب سے اچھی لگتی تھی سانولی سلونی شاما۔ لانبی پتلی، بے چین دُم والی شاما۔

شاما تو یہاں بھی آتی ہے اور گوریاں بھی۔ اور آس پاس کے درختوں پہ فاختہ آواز لگاتی ہے ''اے دوست تو'' اور تمہاری چھت پر رکھے ان سو سوا سو گملوں میں پھول ہی پھول کھل جاتے ہیں تو پھر تنو بی بی تم دل گرفتہ اور اداس کیوں رہتی ہو؟ کیوں تم نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو گرد کی طرح دامن سے جھاڑ رکھا ہے؟

گوپال نے صرف ایک بات اداس ہو کر کہی تھی...... ''ہمیں اب کوئی لپا گو کیوں نہیں کہتا۔''

''ارے منوا ماٹی ملے......'' سڑک سے گزرتی بچیا دھوبن نے اپنے لڑکے کو زور سے ڈانٹا جو گٹھری سر پہ رکھ کر ٹیڑھا میڑھا چل رہا تھا...... پنجرے میں مٹھو نے نقل اتاری...... ''ارے منو ماٹی ملے۔'' تنو بے ساختہ ہنس پڑی۔ ایسی ہنسی جو دل کے اندر پھوٹتی ہے جس کے دیکھے سنے جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔

سڑک پر رام دھن کی گیار نبھائی۔ بکری کے دو سیاہ مخملی بچے آڑے آڑے پھدکے۔ زینا کے پودوں میں سے شوخ کلیوں نے جھانک کر دیکھا۔ آسمان میں پھر بادل اٹھے۔ ہاتھی جیسے سیاہ اور روئی جیسے ہلکے۔ قدرت کا تضاد۔ میناؤں کا ایک جھنڈ بھرا مار کے اڑا۔ طوطوں کی ڈار نے سبز رنگ بکھیرا۔ پڑوسن کے ننھے پوتے نے پالنے میں 'غاؤں غاؤں' کی۔ اس کی خوبصورت کم سن ماں نے منڈیر سے جھانک کر کہا ''تنو چاچی...... اچھی ہیں نا؟ کوئی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔ اب کی آپ کے گل داؤدی ہمیشہ سے اچھے کھلیں گے۔ پودے خوب ہرے ہیں۔'' دنیا بہت حسین تھی اور ذہن کو منور کرنے کے لئے یادوں کے جگنو تھے اور فرد اپنی ذات میں انجمن تھا اور ہر کسی کی زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی لپا گو تھا اور کوئی اچھن، کوئی بھیا، کوئی جمیل بھائی اور دادی جیسی غیر مشروط محبت کرنے والی کوئی ہستی اور خوش رہنے کی بھی اتنی ہی وجوہات تھیں جتنی اداس رہنے کے لیے...... شرط صرف انہیں پلکوں سے چن لینے کی تھی۔

☆☆